

مَنَّا كَرِيْمًا وَنَسْتَعِيْزُ بِالْكَرِيْمِيْنَ

جلد سوم  
جزء اول

شماره نمبر  
20

جمادی ثانیہ، ۱۴۳۱ھ، جون ۲۰۱۰ء

# السنۃ



مدیر

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

سب سے بڑا سوال

اللہ کہاں ہے؟

اوقات نماز

قارئین کے سوالات

اسلاف پرستی سے اصنام پرستی تک!

صحیح بخاری کا مطالعہ اور فقہانہ انکار حدیث

باللہ العزیز



دارالتخصص والتحقیق، جہلم، پاکستان  
AhleSunnatpk.com



شماره نمبر 19 ، جمادی اولیٰ، ۱۴۳۱ھ، مئی 2010

- 2 غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری اللہ کہاں ہے؟
- 6 غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری اوقاتِ نماز
- 13 غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری اسلاف پرستی سے اصنام پرستی تک !
- 23 غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری قارئین کے سوالات
- صحیح بخاری کا مطالعہ اور فتنہ انکارِ حدیث
- 34 حافظ ابو یحییٰ نور پوری سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی منقبت میں حدیثِ براء بن عازب رضی اللہ عنہ
- وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ...
- 40 کے شانِ نزول کے متعلق حدیث جابر رضی اللہ عنہ

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

## اللہ کہاں ہے؟

اہل سنت والجماعت کا اجماعی و اتفاقی عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے اور اپنی مخلوق سے جدا ہے۔ جیسا کہ:

① امام مالک بن انس رحمہ اللہ (م ۱۷۹ھ) فرماتے ہیں: اللہ عزّ وجلّ فی السّماء، وعلّمہ فی کلّ مکان، لا یخلو من علمہ مکان. ”اللہ عزّ وجلّ آسمانوں سے اوپر (عرش پر) ہے، لیکن اس کا علم ہر جگہ میں ہے، کوئی جگہ اس کے علم سے خالی نہیں۔“ (الشریعة للآجری: ۱۰۷۶/۳-۱۰۷۷، الرقم: ۶۵۲-۶۵۳، مسائل الامام احمد لابی داؤد: ص ۲۶۳، التمهید لابن عبد البر: ۱۳۸/۷، وسندہ صحیح)

② امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ (م قبل ۱۵۰ھ) فرمان باری تعالیٰ: ﴿مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَآبِعُهُمْ﴾ (المجادلة: ۷) (کوئی تین شخص سرگوشی نہیں کرتے، مگر اللہ تعالیٰ ان کا چوتھا ہوتا ہے) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: هو علی العرش، وعلّمہ معہم. ”اللہ تعالیٰ عرش پر ہی ہے، لیکن اس کا علم ان کے ساتھ ہے۔“

(تفسیر الطبری: ۱۲/۲۸، الشریعة للآجری: ۶۵۵، وسندہ صحیح)

③ شیخ الاسلام، المجاہد، القدوہ، الامام، عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ (م ۱۸۱ھ) کے بارے میں امام، حافظ، ثقہ، علی بن الحسن بن شقیق رحمہ اللہ (م ۲۱۵ھ) بیان کرتے ہیں:

سألت عبد الله بن المبارك: كيف ينبغي لنا أن نعرف ربنا عز وجل؟ قال: على السماء السابعة على عرشه، بائن من خلقه، ولا نقول كما تقول الجهميّة: انه هاهنا في الأرض. ”میں نے امام عبداللہ بن المبارک سے سوال کیا، ہمیں اپنے رب عز وجل کو کس طرح پہچاننا چاہیے؟ آپ رحمہ اللہ نے فرمایا، (اللہ تعالیٰ) ساتویں آسمان کے اوپر اپنے عرش پر ہے، اپنی مخلوق سے جدا ہے، ہم جہمیوں کے طرح یہ نہیں کہتے کہ وہ یہاں زمین میں ہے۔“ (السنة

لعبد الله بن احمد: ۱۱۱/۱، ح: ۲۲، ۱۷۴/۱-۱۷۵، ح: ۲۱۶، الرد علی المریسی

للداری : ص ۱۰۳ ، الرد علی الجهمیة للداری : ص ۵۰ ، الاسماء والصفات للبيهقي :  
۹۰۳ ، وسنده صحيح

حافظ ذہبی رحمہ اللہ اس قول کے بارے میں فرماتے ہیں : هذا صحيح ثابت .  
”یہ قول صحیح اور ثابت ہے۔“ (العرش للذهبي : ۲/۲۴۰)

حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں :  
وروی عبد اللہ بن الامام أحمد وغيره  
بأسانيد صحيحة عن ابن المبارك . ”(اس قول کو) امام احمد کے بیٹے عبد اللہ وغیرہ نے  
صحیح سند کے ساتھ امام عبد اللہ بن المبارک سے نقل کیا ہے۔“ (الفتوى الحموية لابن تيمية : ص ۹۱)  
حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں :  
وقد صح عنه صحة قريبة من التواتر .

”یہ قول آپ (امام عبد اللہ بن المبارک رحمہ اللہ) سے اس قدر صحیح ثابت ہے کہ متواتر کے قریب پہنچ  
گیا ہے۔“ (اجتماع الجيوش الاسلامية لابن القيم : ۲۱۳-۳۱۴)

③ امام عبد الرحمن بن مہدی العنبری رحمہ اللہ (م ۱۹۸ھ) فرماتے ہیں :

وأرادوا أن ينفوا أن يكون الرحمن على العرش استوى ، وأرادوا أن ينفوا أن  
يكون القرآن كلام الله تعالى ، أرى أن يستتابوا ، فإن تابوا ، وإلا ضربت أعناقهم .  
”ان جہمیہ نے ارادہ کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا انکار کر دیں ، اسی طرح انہوں  
نے یہ بھی ارادہ کیا ہے کہ وہ قرآن کے کلام باری تعالیٰ ہونے کا انکار کر دیں ، میرا خیال ہے کہ ان سے  
توبہ کروائی جائے ، اگر یہ توبہ کریں تو درست ، ورنہ ان کی گردنیں اڑادی جائیں۔“

(الاسماء والصفات للبيهقي : ۵۴۶ ، وسنده حسن)

⑤ امام محمد بن مصعب العابد رحمہ اللہ (م ۲۲۸ھ) فرماتے ہیں :

من زعم أنك لا تكلم ولا ترى في الآخرة ، فهو كافر بوجهك ، لا يعرفك  
، أشهد أنك فوق العرش فوق سبع سموات ، ليس كما يقول أعدائك الزنادقة .  
”(اے اللہ!) جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ آخرت میں تجھ سے کوئی کلام نہیں کرے گا ، نہ ہی کوئی تیرا  
دیدار کر سکے گا ، وہ تیرے چہرے کا منکر اور تیری ذات سے جاہل ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ساتوں  
آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے ، ایسا نہیں ہے ، جیسے تیرے دشمن زندیق لوگ کہتے ہیں (یعنی وہ کہتے ہیں

کہ تو ہر جگہ ہے)۔“ (تاریخ بغداد للخطیب : ۲۸۰/۳، وسندہ صحیح)

⑥ امام حمیدی رحمہ اللہ (م ۲۱۹ھ) فرماتے ہیں: السنة عندنا ... يقول (الرجل): ﴿الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى﴾ ، ومن زعم غير هذا ، فهو معطل جهمي . ”ہمارے نزدیک سنت یہ ہے کہ۔۔۔ آدمی کہے، رحمن عرش پر مستوی ہے، اور جو شخص اس کے خلاف کوئی دعویٰ کرتا ہے، وہ معطل (صفات باری تعالیٰ کا منکر) اور جہمی ہے۔“

(اصول السنة للحمیدی : ص ۵۴۷، مندرج فی آخر مسندہ)

④، ⑧ امام عبد الرحمن بن ابی حاتم رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام ابو زرہ الرازی رحمہ اللہ (م ۲۶۳ھ) اور (اپنے والد) امام ابو حاتم الرازی رحمہ اللہ (م ۲۷۷ھ) سے اہل سنت والجماعت کے اجماعی و اتفاقی عقیدہ و مذہب کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا:

أدر كنا العلماء في جميع الأمصار ، حجازا وعراقا ، ومصرًا وشاما ، ويمنا ، وكان من مذهبهم أن الله على عرشه بائن من خلقه ، كما وصف نفسه بلا كيف ، أحاط بكل شيء علما . ”ہم نے تمام علاقوں، حجاز، عراق، مصر، شام اور یمن میں علمائے کرام کو دیکھا ہے، ان کا عقیدہ و مذہب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر مستوی اور اپنی مخلوق سے جدا ہے، جیسا کہ اس نے خود بیان فرمایا ہے، کوئی کیفیت بیان نہیں کی جائے گی، اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اپنے علم کے اعتبار سے گھیر رکھا ہے۔“ (کتاب اصل السنة واعتقاد الدين لابن ابی حاتم : ص ۱۹-۲۶)

⑨ امام عثمان بن سعید الدارمی رحمہ اللہ (م ۲۸۰ھ) فرماتے ہیں:

قد اتفقت الكلمة من المسلمين أن الله تعالى (بکماله) فوق عرشه فوق سماواته . ”اس بات پر مسلمانوں کا کلمہ ایک ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کمال کے ساتھ اپنے آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر ہے۔“ (الرد علی بشر المریسی : ۳۴۰/۱)

⑩ امام محمد بن عثمان بن ابی شیبہ رحمہ اللہ (م ۲۹۷ھ) فرماتے ہیں:

ذكروا أن الجهمية يقولون : ليس بين الله عز وجل وبين خلقه حجاب ، وأنكروا العرش ، وأن يكون هو فوقه وفوق السماوات ، وقالوا : إن الله في كل مكان . ”انہوں نے ذکر کیا ہے کہ جہمی لوگوں کے بقول اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے

درمیان کوئی پردہ نہیں، نیز انہوں نے اللہ تعالیٰ کے آسمانوں کے اوپر عرش پر ہونے کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ میں ہے۔“ (کتاب العرش لابن ابی شیبہ: ۲)

نیز فرماتے ہیں: ثم تواترت الأخبار أنّ الله تعالى خلق العرش فاستوى عليه بذاته ، فهو فوق السماوات ، وفوق العرش بذاته ، متخلصا من خلقه ، بائنا منهم ، علمه في خلقه ، لا يخرجون من علمه . ”احادیث متواترہ اس بات پر دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ اپنے عرش پر مستوی ہے، چنانچہ وہ آسمانوں کے اوپر اپنی ذات کے ساتھ عرش پر ہے، اپنی مخلوق سے علیحدہ و جدا ہے، اس کا علم اس کی مخلوق میں ہے، وہ اس کے علم سے باہر نہیں ہو سکتے۔“ (کتاب العرش لابن ابی شیبہ: ۲)

تلك عشرة كاملة یہ پورے دس اقوالِ محدثین ہیں۔



### ٹھنڈا پانی

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أول ما يحاسب به العبد يوم القيامة أن يقال : ألم أصحّ جسمك ، وأروك من الباء البار د ؟

”قیامت کے دن بندے سے سب سے پہلے جو حساب کیا جائے گا، وہ یہ کہا جائے گا کہ کیا میں نے تیرے جسم کو تندرستی نہیں دی تھی اور کیا میں نے تجھے ٹھنڈے پانی سے سیراب نہیں کیا تھا؟

(سنن الترمذی: ۳۳۵۸، الاوائل لابن ابی عاصم: ۸۵، ۱۵۴، تفسیر ابن جریر: ۲۸۸/۳۰، زوائد الزهد لعبد اللہ بن احمد: ص ۴۰، المعجم الاوسط للطبرانی: ۶۲، شعب الایمان للبیہقی: ۴۲۸۷، وسندہ صحیح)

اس حدیث کو امام ابن حبان (۷۳۶۲) اور امام حاکم (۱۳۸/۴) نے ”صحیح“ کہا ہے۔

غلام مصطفیٰ ظہیر اسن پوری

## اوقاتِ نماز

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَوْقُوتًا﴾

(النساء: ۱۰۳)

”بے شک نماز ایمان والوں پر متعین و مقرر اوقات میں فرض کی گئی ہے۔“

**ظہر کا وقت :** اللہ کے فضل و رحمت سے اس بات پر اجماعِ مسلمین ہے

کہ نمازِ ظہر کا وقت زوال کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے، جیسا کہ:

① امام ابن المنذر رحمہ اللہ (م ۳۱۸ھ) کہتے ہیں: أجمعوا على أن

وقت الظَّهر زوال الشمس . ”اس بات پر مسلمانوں نے اجماع و اتفاق کیا ہے کہ

ظہر کا وقت سورج کے زوال سے شروع ہوتا ہے۔“ (الاجماع لابن المنذر: ۳۶)

نیز دیکھیں (الوسط لابن المنذر: ۲/۳۲۶، ۳۵۵، الاستذکار لابن عبد البر: ۱/۳۸، التمهيد

لابن عبد البر: ۸/۷۰، الافصح لابن هبيرة: ۱/۷۶، المبسوط للسرخسي: ۱/۱۴۲، عارضة

الاحوذى لابن العربي: ۱/۲۵۵، بدائع الصنائع للکاسانی: ۱/۳۵۰، المجموع للنووي: ۳/۲۴، فتح

الباری لابن حجر: ۲/۲۱، وغیرہم)

② سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”وقت الظَّهر إذا زالت الشمس ...“

”شروع ہو جاتا ہے۔“ (صحیح مسلم: ۱۷۳/۶۱۲)

③ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

إذا صلينا خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم بالظَّهائر سجدنا على ثيابنا

اتقاء الحرّ .

”جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نمازِ ظہر ادا کرتے تھے تو گرمی کی سوزش سے بچنے کے لیے

کپڑے پر سجدہ کرتے تھے۔“ (صحیح البخاری : ۵۴۲، صحیح مسلم : ۶۲۰)

④ سیدنا جناب بن الارت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

شكونا إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم الصلاة في الرّمضاء ، فلم يشكنا .  
 ”ہم نے رسول اللہ ﷺ سے گرمی میں نماز (ظہر) کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے ہماری شکایت کو دوڑ نہیں فرمایا۔“ (صحیح مسلم : ۶۱۹)

⑤ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف خط میں لکھا:

”أَن صَلَّ الظَّهْر إِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ .  
 ”جب زوالِ شمس ہو جائے تو ظہر کی نماز ادا کرو۔“ (الموطا للامام مالك : ۷/۱، وسندہ صحیح)

⑥ میمون بن مہران رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: إِنَّ سُوَيْدَ بْنَ غَفْلَةَ كَانَ يَصَلِّي حِينَ تَزُولُ الشَّمْسُ ، فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ الْحَبَّاجُ : لَا تَسْبِقْنَا بِصَلَاتِنَا ، فَقَالَ سُوَيْدُ : قَدْ صَلَّيْتُهَا مَعَ أَبِي بَكْرٍ وَعَمْرٍو هَكَذَا ، وَالْمَوْتُ أَقْرَبُ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَدْعَهَا .

”سُوَيْدُ بْنُ غَفْلَةَ تَابِعِيَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ زَوَالَ شَمْسٍ كَ وَاقْتِ ظَهْرٍ ادا کیا کرتے تھے، حجاج نے آپ رضی اللہ عنہ کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ ہماری نماز سے پہلے نماز نہ پڑھا کریں، اس پر سُوَيْدُ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، میں نے سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ یہ نماز اسی وقت میں ادا کی ہے۔ اس کو چھوڑنے سے مجھے موت زیادہ محبوب ہے۔“ (کتاب الصلاة لابی نعیم الفضل بن دکین : ۳۴۴، مصنف ابن ابی شیبہ : ۳۲۳/۱، وسندہ صحیح)

⑦ شہاب العنبری کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ظہر کے وقت کے بارے میں سوال کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ عَنْ نِصْفِ النَّهَارِ وَكَانَ الظِّلُّ قَيْسَ الشَّرَاكِ فَقَدْ قَامَتِ الظَّهْرُ .

”جب سورج نصف النہار سے ڈھل جائے اور سایہ ایک تسمہ کے برابر ہو جائے تو ظہر کی نماز کا وقت ہو جائے گا۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ : ۳۲۳/۱، وسندہ صحیح)

**تنبیہ نمبر ① :** وہ احادیث جن میں نمازِ ظہر کو گرمی کی وجہ سے ٹھنڈا کرنے کا حکم ہے، ان کا تعلق سفر سے ہے، نہ کہ حضر سے۔ (دیکھیں صحیح البخاری : ۷۷/۱، ح :



۵۳۹، صحیح مسلم: ۲۲۴/۱، ح: ۶۱۶)

## تنبیہ نمبر ۲ :

صحیح البخاری (۴۹۱/۱، ح: ۳۴۵۹) میں ہے کہ

یہودیوں نے آدھے دن تک ایک قیراط پر کام کیا اور عیسائیوں نے آدھے دن سے عصر تک ایک قیراط پر کام کیا اور مسلمانوں نے عصر سے شام تک دو قیراط پر کام کیا تو یہود و نصاریٰ نے اس پر اعتراض کیا کہ ان کا وقت تھوڑا ہے اور اجرت زیادہ ہے۔۔۔

اس حدیث پاک سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ظہر سے لے کر عصر تک کا وقت عصر سے شام تک کے وقت سے زیادہ ہے اور بس!

## ظہر کا آخری وقت :

نمازِ ظہر کا وقت ایک مثل سایہ پر ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

① سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أَمَنِي جَبْرِيلُ عِنْدَ الْبَيْتِ مَرَّتَيْنِ ، فَصَلَّى بِي الظَّهْرَ حِينَ زَالَتِ الشَّمْسُ ، وَكَانَتْ بِقَدْرِ الشَّرَاكِ ، وَصَلَّى بِي الْعَصْرَ حِينَ كَانَ ظِلُّ كُلِّ شَيْءٍ مِثْلَهُ ، وَصَلَّى بِي الْمَغْرِبَ حِينَ أَفْطَرَ الصَّائِمَ ، وَصَلَّى بِي الْعِشَاءَ حِينَ غَابَ الشَّفَقُ ، وَصَلَّى بِي الْفَجْرَ حِينَ حَرَّمَ الطَّعَامَ وَالشَّرَابَ عَلَى الصَّائِمِ ، وَصَلَّى بِي الْغَدَ الظَّهْرَ حِينَ كَانَ ظِلُّ كُلِّ شَيْءٍ مِثْلَهُ ، وَصَلَّى بِي الْعَصْرَ حِينَ كَانَ ظِلُّ كُلِّ شَيْءٍ مِثْلِيهِ ، وَصَلَّى بِي الْمَغْرِبَ حِينَ أَفْطَرَ الصَّائِمَ ، وَصَلَّى بِي الْعِشَاءَ ثَلَاثَ اللَّيْلِ ، وَصَلَّى بِي الْفَجْرِ فَأَسْفَرَ ، ثُمَّ التَفْتُ إِلَى فَقَالَ : يَا مُحَمَّدُ ! هَذَا الْوَقْتُ وَقْتُ النَّبِيِّينَ قَبْلَكَ ، الْوَقْتُ مَا بَيْنَ هَذَيْنِ الْوَقْتَيْنِ . ”جبریل علیہ السلام نے مجھے بیت اللہ کے پاس دو دفعہ امامت کروائی، چنانچہ نمازِ ظہر پہلی دفعہ اس وقت پڑھی، جب سورج ڈھل گیا اور سایہ ایک تمسہ کے برابر تھا اور نمازِ عصر مجھے (پہلی دفعہ) اس وقت پڑھائی، جب ہر چیز کا سایہ اس کی مثل ہو گیا اور نمازِ مغرب اس وقت پڑھائی، جب روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے۔ نمازِ عشاء (پہلی دفعہ) اس وقت پڑھائی، جب شفق (سرخ) غائب ہو گئی تھی اور نمازِ فجر اس وقت پڑھائی، جب کھانا پینا روزہ دار پر حرام ہو جاتا ہے (لیکن جب دوسرا دن ہوا تو) نمازِ ظہر مجھے اس وقت پڑھائی، جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا، نمازِ عصر مجھے اس وقت

پڑھائی، جب ہر چیز کا سایہ دوشل ہو گیا تھا، نمازِ مغرب اسی وقت پڑھائی، جب روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے اور عشاء رات کی ایک تہائی گزرنے کے بعد پڑھائی اور فجر روشنی میں ختم کی، پھر جبریل علیہ السلام میری طرف متوجہ ہو کر گویا ہوئے، اے محمد! یہ آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کا وقت ہے۔ (آپ اور آپ کی امت کے لیے) نمازوں کا وقت ان دونوں (اول و آخر) وقتوں کے درمیان ہے۔“

(مسند الامام احمد: ۱/۳۳۳، ۳۵۴، مسند عبد بن حمید: ۷۰۳، سنن ابی داؤد: ۳۹۳، سنن

الترمذی: ۱۴۹، سنن الدارقطنی: ۱/۲۵۸، المستدرک للحاکم: ۱/۱۹۳، وسندہ حسن)

اس حدیث کو امام ابن الجارود رحمہ اللہ (۱۴۹-۱۵۰)، امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ (۳۲۵) نے ”صحیح“ اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے ”حسن صحیح“ اور حافظ بغوی رحمہ اللہ (۳۲۸) نے ”حسن“ کہا ہے۔

حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند پر بعض الناس نے بغیر دلیل کے کلام کی ہے، اللہ کی قسم! اس کے سارے راوی معروف النسب اور مشہور بالعلم ہیں۔“

(التمہید لابن عبد البر: ۸/۲۵-۲۶، ۲۷-۲۸)

علامہ ابن العربی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سارے کے سارے راوی مشہور ثقہ ہیں، خاص کر امامت جبریل کے متعلق حدیث کی اصل صحیح ہے، یہ روایت مجمل کی تفسیر اور مشکل کی وضاحت ہے۔“ (عارضۃ الاحوذی: ۱/۱۵۰-۱۵۱)

اس کے راوی عبد الرحمن بن حارث کو امام ابن سعد، امام عجل اور امام ابن حبان رحمہم اللہ نے ثقہ کہا ہے۔ امام ابن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لیس بہ بأس۔ ”اس میں کوئی خرابی نہیں۔“

نیز جمہور کے نزدیک یہ ”موثق، حسن الحدیث“ ہے۔ اس پر امام نسائی رحمہ اللہ کی جرح مردود ہے۔ اس کے دوسرے راوی حکیم بن حکیم کو امام عجل، امام ابن حبان اور ابن خفون رحمہم اللہ نے ثقہ کہا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ راوی ہے۔ (المغنی للذہبی: ۱/۲۸۳)

نیز فرماتے ہیں کہ یہ ”حسن الحدیث“ ہے۔ (الکاشف للذہبی: ۱/۱۸۵)

امام ابن سعد رحمہ اللہ کی جرح کئی وجہ سے مردود ہے، لہذا حکیم بن حکیم راوی جمہور کے نزدیک ”حسن الحدیث“ ہیں۔

② سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وقت الظہر إذا زالت الشمس وكان ظل الرجل كطوله ما لم يحضر العصر .  
 ”ظہر کا وقت ہوتا ہے، جب سورج ڈھل جائے اور (ختم تب ہوتا ہے، جب) آدمی کا سایہ اس کے قد کے برابر ہو جائے، جب تک کہ عصر کا وقت شروع نہ ہو۔“ (صحیح مسلم: ۲۲۳/۱، ح: ۶۱۲)  
 جناب تقی عثمانی دیوبندی صاحب کہتے ہیں: ”مثیلین پر ظہر کا وقت ختم ہونے کے سلسلہ میں عموماً احناف کی طرف سے تین دلیلیں پیش کی جاتی ہیں، لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی حدیث بھی اوقات کی تحدید پر صریح نہیں ہے، اس کے برخلاف حدیث جبریل میں صراحۃً پہلے دن عصر کو مثل اول پر پڑھنے کا ذکر موجود ہے، اس لیے یہ حدیث جبریل کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، اس بنا پر بعض حنفیہ نے مثل اول والی روایت کو لیا ہے۔ کما فی الدر المختار اور بعض حنفیہ نے وقت مہمل کو ترجیح دی ہے۔“ (درس ترمذی از تقی عثمانی: ۳۹۶/۱)

جناب محمد بن علی نیموی حنفی اعتراف حقیقت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”مجھے کوئی حدیث صریح، صحیح یا ضعیف نہیں ملی، جو اس پر دلالت کرے کہ ظہر کا وقت سایہ کے دو مثل ہونے تک ہے۔“ (آثار السنن مترجم: ص ۱۲۸، ح: ۱۹۹)  
**الحاصل:** نمازِ ظہر کا اول وقت زوال کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے اور ایک مثل سایہ پر ختم ہو جاتا ہے۔

## نماز عصر کا وقت

نمازِ عصر کا وقت ایک مثل سایہ پر شروع ہو جاتا ہے اور دو مثل سایہ پر اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

① سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أَمْسَى جَبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ عِنْدَ الْبَيْتِ مَرَّتَيْنِ ... ثُمَّ صَلَّى الْعَصْرَ حِينَ كَانَ ظِلُّ كُلِّ شَيْءٍ مِثْلَهُ ... ”جبریل علیہ السلام نے مجھے بیت اللہ کے قریب دو مرتبہ نماز پڑھائی۔۔۔ پھر عصر کی نماز اس وقت پڑھائی، جب ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو گیا۔۔۔“

(مسند الامام احمد: ۳۳۳/۱، ۳۵۴، مسند عبد بن حمید: ۷۰۳، سنن ابی داؤد: ۳۹۳، سنن

الترمذی: ۱۴۹، سنن الدارقطنی: ۲۵۸/۱، المستدرک للحاکم: ۱۹۳/۱، وسندہ حسن)

عبد اللہ بن رافع مولیٰ ام سلمہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

**فائدہ جلیلہ:**

سے اوقات نماز کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

أنا أخبرك ، صلّ الظهر إذا كان ظلك مثلك ، والعصر إذا كان ظلك مثلك .  
”میں تمہیں بتاتا ہوں، ظہر کی نماز اس وقت پڑھو، جب تمہارا سایہ ایک مثل ہو جائے اور عصر کی نماز اس وقت پڑھو، جب تمہارا سایہ دو مثل ہو جائے۔“

(الموطا للامام مالك : ۸/۱ ، وسنده صحيح)

علامہ عبدالحی لکھنوی حنفی اس اثر کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فكانه قال : الظهر من الزوال إلى أن يكون ظلك مثلك ، والعصر من ذلك الوقت إلى أن يكون ظلك مثلك ...  
”گویا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ ظہر کا وقت زوال سے لے کر تمہارے سائے کے ایک مثل ہونے تک ہے اور عصر کا وقت اس وقت سے لے کر تمہارے سائے کے دو مثل ہونے تک ہے۔“

(التعليق الممجد لعبد الحى اللكنوى : ۴۱/۱ ، حاشية : ۹)

ثابت ہوا کہ ظہر کا وقت زوال سے لے کر ایک مثل سایہ تک رہتا ہے، جبکہ عصر کا وقت ایک مثل سے لے کر دو مثل تک رہتا ہے۔ بعض لوگ سنت کی مخالفت میں عصر کا اول وقت بغیر عذر کے ترک کر دیتے ہیں۔ حدیث میں ان کے بارے میں وعید شدید آئی ہے، جیسا کہ

علاء بن عبد الرحمن کہتے ہیں: انہ دخل على أنس بن مالك في داره بالبصرة حين انصرف من الظهر وداره بجانب المسجد ، فلما دخلنا عليه قال : أصليتم العصر ؟ فقلنا له ، فلما انصرفنا قال : سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول : تلك صلاة المنافق ، يجلس يرقب الشمس حتى إذا كانت بين قرني الشيطان قام ، فنقرها أربعا ، لا يذكر الله فيها إلا قليلا ...

”وہ نماز سے فارغ ہو کر سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے گھر گئے، جو بصرہ میں واقع تھا، آپ کا گھر مسجد کے پڑوس میں تھا، جب ہم آپ پر داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا، کیا تم نے عصر کی نماز پڑھ لی ہے؟ ہم نے کہا، ہم ابھی نماز سے فارغ ہوئے ہیں، فرمایا، عصر کی نماز پڑھ لو، ہم کھڑے ہوئے اور نماز عصر پڑھ لی، جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا

ہے کہ یہ منافق کی نماز (کی حالت) ہے کہ سورج کی انتظار میں بیٹھا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ شیطان کے دوہینگوں کے درمیان میں آجاتا ہے تو کھڑا ہو کر چار ٹھونگیں لگاتا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت تھوڑا کرتا ہے۔۔۔“ (صحیح مسلم: ۱/۲۲۵، ح: ۶۲۲) ثابت ہوا کہ نمازِ عصرِ اول وقت ادا کرنی چاہیے، آج بھی اہل بدعت کی مساجد میں نمازِ عصر تاخیر سے پڑھی جاتی ہے۔

**شبہ نمبر ①:** سوار بن شیب، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہتے

ہیں: **انہ کان یؤخر العصر حتی أقول: قد اصفرّت الشمس .**

”آپ رضی اللہ عنہ نمازِ عصر کو اتنا مؤخر کرتے کہ میں کہتا، سورج زرد ہو گیا ہے۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۳۲۷، وسندہ صحیح)

**تبصرہ:** سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ فتویٰ گزر چکا ہے کہ عصر کا آخری وقت دو مثل تک ہے، جبکہ اس اثر میں مذکور زردی سے مراد دو مثل سے پہلے والی زردی ہے۔

**شبہ نمبر ②:** سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں آیا ہے:

”آپ رضی اللہ عنہ نمازِ عصر کو مؤخر کرتے تھے۔“

**انہ کان یؤخر العصر .**

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۳۲۷)

**تبصرہ:** اس کی سند ابواسحاق السبعی کی ”تدلیس“ کی وجہ سے ”ضعیف“ ہے۔

رشید احمد گنگوہی دیوبندی صاحب کہتے ہیں: ”ایک مثل کا مذہب قوی ہے، لہذا ایک مثل پر عصر پڑھے تو ادا ہو جاتی ہے، اعادہ نہ کرے۔“ (فتاویٰ رشیدیہ: ص ۲۸۵)

\*\*\*\*\*

اعتذار از ناشر

**السنة**، شمارہ نمبر ۱۹، صفحہ نمبر ۶ اور ۷ میں آیتِ کریمہ میں کمپوزنگ کی غلطی سے **مِنَ الْجَنَّةِ** کی بجائے **مِنَ الْجَنَّةِ**۔ صفحہ نمبر ۷ اور ۸ میں آیتِ کریمہ میں **وَرَاءَ حِجَابٍ** کی بجائے **وَرَاءَ حِجَابٍ** اور **يُرْسَلُ** کی بجائے **يُرْسَلِ**۔ صفحہ نمبر ۲۳ پر سطر نمبر ۱۷ میں ”دودھ نہ پلانا متعین ہے۔“ کی بجائے ”دودھ پلانا متعین ہے۔“ اسی طرح صفحہ نمبر ۴۸ پر آیتِ کریمہ میں **مِنْ نَّجْوَى** کی بجائے **مَنْ نَّجْوَى** شائع ہو گیا ہے۔ قارئین کرام تصحیح فرمائیں!

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

## اسلاف پرستی سے اصنام پرستی تک !

اسلاف پرستی ہی بت پرستی ہے، دنیا میں شرک، اولیاء و صلحاء کی محبت و تعظیم میں غلو کے باعث پھیلا، جیسا کہ امام بریلویت احمد رضا خان (۱۸۵۶-۱۹۲۱ء) اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہوئے کہ ”بت پرستی کا آغاز تعظیم سے ہوا“ لکھتے ہیں:

”دنیا میں بت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ صالحین کی محبت میں ان کی تصویریں بنا کر گھروں اور مسجدوں میں تبرکاً رکھیں اور ان سے لذتِ عبادت کی تائید سمجھی، شدہ شدہ وہی معبود ہو گئیں۔ صحیح بخاری (۷۳۲/۲) صحیح مسلم (صحیح مسلم میں یہ روایت نہیں ہے۔ غ، م) میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت کریمہ: ﴿وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ... وَنَسُوا﴾ (کافروں نے کہا، ہرگز اپنے خداؤں کو نہ چھوڑو اور وہ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو بھی نہ چھوڑو)

کی تفسیر میں ہے: قال: كانوا اسماء رجال صالحين من قوم نوح، فلما هلكوا أوحى الشيطان إلى قومهم أن نصبوا إلى مجالسهم التي كانوا يجلسون أنصابا وسموها بأسمائهم، ففعلوا، فلم يعبد حتى إذا هلك أولئك ونسخ العلم عبادت. ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، یہ حضرت نوح (علیہ السلام) کی قوم کے نیک

اور پارسا لوگوں کے نام ہیں، جب وہ وفات پا چکے تو شیطان نے بعد والوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ جہاں یہ لوگ بیٹھتے تھے، وہیں ان مجالس میں انہیں نصب کر دو (یعنی قرینہ سے انہیں کھڑا کر دو) اور جو نام ان کے (زندگی میں) تھے، وہی نام رکھ دو تو لوگوں نے (جہالت سے) ایسا ہی کیا، پھر کچھ عرصہ ان کی عبادت نہ ہوئی، یہاں تک کہ جب وہ تعظیم کرنے والے مر گئے اور علم مٹ گیا (اور ہر طرف جہالت پھیل گئی) تو پھر ان کی عبادت شروع ہو گئی۔“ (فتاویٰ رضویہ: ۵۷۳/۲۴)

حافظ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ (۷۸۳-۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:

وقصة الصالحين كانت مبدأ عبادة قوم نوح هذه الأصنام، ثم تبعهم من بعدهم

علیٰ ذلک۔ ”نیک لوگوں (کی تعظیم) کا قصہ ہی قوم نوح کے ان بتوں کی عبادت

کرنے کا نقطہ آغاز تھا، پھر بعد والے ان کے پیچھے لگ گئے۔“ (فتح الباری لابن حجر: ۶۶۹/۸)  
 سورہ نوح کی آیت نمبر (۲۱) کی تفسیر میں امام قتادہ بن دعامہ تابعی رحمہ اللہ (م ۱۱۸ھ) فرماتے ہیں:  
 كانت آلهة يعبدها قوم نوح، ثم عبدت العرب بعد ذلك.

”یہ معبودانِ باطلہ تھے، جن کی عبادت قوم نوح کرتی تھے، پھر اس کے بعد عربوں نے ان کی عبادت شروع کر دی۔“ (تفسیر ابن جریر: ۶۴۰/۲۳، وسندہ صحیح)

عربوں میں بت پرستی کا رجحان اسی بنا پر پیدا ہوا، جیسا کہ عظیم تابعی امام مجاہد بن جبر رحمہ اللہ (م ۱۰۴ھ) ﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:  
 ”للات حاجیوں کے لیے ستو بھگویا کرتا تھا۔“

(تفسیر ابن جریر: ۵۲۳/۲۲، وسندہ حسن)

نیز فرماتے ہیں: کان يلت السويق للحاج، فعكف على قبره.  
 ”للات حاجیوں کے لیے ستو گھولا کرتا تھا، چنانچہ (اس کی اس نیکی کی تعظیم میں) اس کی قبر پر اعتکاف کیا جانے لگا۔“ (تفسیر ابن جریر: ۵۲۳/۲۲، وسندہ صحیح)

واضح ہوا کہ لات و عزیٰ نیک بزرگ تھے، مرنے کے بعد ان کی عبادت شروع ہو گئی، ان کے ناموں پر بتوں کے نام رکھ لیے گئے۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی کچھ یونہی ہوا کہ بزرگوں کی محبت و تعظیم میں اس قدر غلو سے کام لیا گیا کہ جس طرح ہندوؤں نے اپنے بزرگوں کے ناموں پر بت گھڑ لیے، جیسے رام چندر، ہنومان، کرشن، پاربتی سینا اور گومت بدھ وغیرہ، اسی طرح مسلمانوں نے اپنے بزرگوں کی قبروں پر قبے سجا کر ان کی عبادت شروع کر دی۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس بات کی یوں نشاندہی کرتے ہیں:

إنّ تلك الأسماء وقعت إلى الهند، فسمّوا بها أصنامهم.  
 ”(قوم نوح کی پیروی میں) یہ نام ہندوستان میں بھی وقوع پذیر ہوئے، ہندوستانیوں نے بھی اپنے بتوں اور مقبروں کے نام قوم نوح کی طرح رکھ لیے۔“ (فتح الباری لابن حجر: ۶۶۸/۸)  
 بزرگوں کی تعظیم میں غلو کے حوالے سے مشرکین ہند کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

① امام بریلویت احمد رضا خان بریلوی لکھتے ہیں:

”اولیاء بعد انتقال بھی دنیا میں تصرف فرماتے اور مشکلیں حل کرتے ہیں۔“

(الامن والعلی از احمد رضا خان : ص ۳۶)

② نیز کہتے ہیں: ”مزارات اولیائے کرام کے پاس ان کی روح مبارک کی

تعظیم کے لیے چراغ جلانا بلاشبہ جائز و مستحسن ہے۔“ (فتاویٰ افریقہ از احمد رضا خان : ص ۷۳)

③ احمد یار خان نعیمی بریلوی لکھتے ہیں: ”اس سے معلوم ہوا کہ اگر حضور غوث

پاک نے بارہ برس کی ڈوبی ہوئی برات کو زندہ فرمایا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، اس دولہا کی قبر گجرات، پنجاب میں ہے، اس کا نام کبیر الدین ہے اور شاہ دولہ کے نام سے مشہور ہیں۔ حضور غوث پاک کے خلیفہ ہیں، ان کی قبر شریف زیارت گاہ خاص و عام ہے، ان کی عمر چھ سو برس ہوئی۔“

(تفسیر نور العرفان از نعیمی : ص ۸۸، سورت آل عمران، تحت آیت : ۴۹)

④ امام بریلویت احمد رضا خان بریلوی لکھتے ہیں: ”حضرت سید عبدالوہاب

اکابر اولیائے کرام میں سے ہیں، حضرت سیدی احمد بدوی کبیر کے مزار پر بہت بڑا ہجوم اور میلہ ہوتا تھا، اس مجمع میں چلے آتے تھے، ایک تاجر کی کنیر پر نگاہ پڑی، فوراً نگاہ پھیر لی، خیر نگاہ تو آپ نے پھیر لی، مگر وہ آپ کو پسند آئی، جب مزار شریف پر حاضر ہوئے، ارشاد فرمایا، عبدالوہاب وہ کنیر پسند ہے؟ عرض کی، ہاں! اپنے شیخ سے کوئی بات چھپانا نہ چاہیے، ارشاد فرمایا، اچھا ہم نے تم کو وہ کنیر ہبہ کی۔ اب آپ سکوت میں ہیں کہ کنیر تو اس تاجر کی ہے اور حضور ہبہ فرماتے ہیں۔ معاً وہ تاجر حاضر ہوا اور اس نے وہ کنیر مزار اقدس کی نذر کی، خادم کو ارشاد ہوا، انہوں نے آپ کو نذر کر دی، ارشاد فرمایا، عبدالوہاب اب وہ دیر کا ہے کی، فلاں حجرہ میں لے جاؤ اور اپنی حاجت پوری کرو۔۔۔“

(ملفوظات از احمد رضا خان : حصہ سوم، ص : ۳۰۷)

ایسی خرافات سے ان لوگوں کی کتابیں الٹی پڑی ہیں۔

ہم بتا رہے تھے کہ بزرگوں کی شان حد سے بڑھانا قبر پرستی کا باعث بنا، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان

کرتی ہیں: لَمَّا اشْتَكَى النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَكَرْتُ بَعْضَ نِسَائِهِ

كُنِيسَةً رَأَيْتُهَا بِأَرْضِ الْحَبْشَةِ يُقَالُ لَهَا : مَارِيَّةُ ، وَكَانَتْ أُمُّ سَلَمَةَ وَأُمُّ حَبِيبَةَ رَضِيَ اللَّهُ



عنهما أتتا أرض الحبشة تذكرتا من حسنهما وتصاوير فيها ، فرفع رأسه ، فقال : أولئك إذا مات منهم الرجل الصالح بنو على قبره مسجدا ، ثم صوّروا فيه تلك الصورة ، أولئك شرار الخلق عند الله . ”جب نبی اکرم ﷺ بیمار ہوئے تو ان کی بعض بیویوں نے اس کنیسے کا ذکر کیا، جسے انہوں نے حبشہ کی زمین میں دیکھا تھا، اسے ماریہ کہا جاتا تھا، سیدہ ام سلمہ اور سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا کہ وہ حبشہ کے علاقے میں گئی تھیں، پھر انہوں نے اس کنیسے کے حسن اور اس میں موجود تصاویر کا تذکرہ کیا، اس پر آپ ﷺ نے سر مبارک اٹھایا اور فرمایا، جب ان لوگوں میں سے کوئی نیک شخص فوت ہو جاتا وہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے، پھر اس میں یہ تصویریں بناتے، یہی لوگ بدترین مخلوق ہیں۔“ (صحیح البخاری : ۱۳۴۱، صحیح مسلم : ۵۲۸/۱۶)

ملا علی قاری حنفی (م ۱۰۱۴ھ) اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں :

والمعنى أولئك من أهل الكتاب أو من جماعة اليهود والنصارى إذا مات فيهم الرجل الصالح أى من نبى أو ولى بنوا على قبره مسجدا ، أى متعبدا ، ويسمّوه كنيسة ، ثم صوّروا أى صور الصّحاء تذكيرا بهم ، ترغيبا فى العبادة لأجلهم ، ثم جاء من بعدهم فزيّن لهم أعمالهم وقال لهم : سلفكم يعبدون هذه الصّور ، فوقعوا فى عبادة الأصنام .

”مراد یہ ہے کہ وہ (نادان) لوگ اہل کتاب تھے یا یہود و نصاریٰ میں سے ایک گروہ تھا، جب ان میں سے کوئی نیک آدمی، یعنی کوئی نبی یا کوئی ولی فوت ہو جاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے، یعنی معبد قائم کرتے اور اس کا نام کنیسہ رکھتے تھے، پھر نیک لوگوں کی تصویریں بنا کر رکھتے تاکہ ان کی یاد آتی رہے اور ان کے ذریعے عبادت میں رغبت پیدا ہو، پھر ان کے بعد والے لوگ آئے تو شیطان نے ان کے لیے پہلوں کے کارنامے مزین کر دیئے اور ان سے کہا کہ تمہارے اسلاف تصویروں کی پرستش کیا کرتے تھے تو پھر یہ لوگ ان کی عبادت میں مصروف ہو گئے۔“

(مرعاة المفاتيح لملا علی القاری الحنفی : ۲۸۲/۸)

یعنی بزرگوں کی حد درجہ تعظیم ان کے مرنے کے بعد ان کی تصویریں بنانے کا باعث بنی۔ ایک عرصہ گزر جانے کے بعد ان کی قبر پرستی شروع ہو گئی، ایک وقت کے بعد ان کے بت گھرے گئے۔

معلوم ہوا کہ قبر پرستی ہی بت پرستی ہے، شروع سے لے کر اب تک انسانوں میں شرک اسی طریقہ سے پھیلا۔

**تنبیہ بلیغ :** بعض الناس یہ کہتے نہیں تھکتے کہ اب امت میں شرک نہیں آسکتا، اس کے ثبوت پر وہ یہ حدیث پیش کرتے ہیں، سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

وإني والله! ما أخاف عليكم أن تشرکوا بعدی .

”اللہ کی قسم! میں تم پر اس بات کا خوف نہیں کرتا کہ تم میرے بعد شرک کرو گے۔“

(صحیح البخاری : ۱۳۴۴، صحیح مسلم : ۲۲۹۶)

**تبصرہ :** ① یہ انتہائی گمراہ کن نظریہ ہے۔ یہ خالص برصغیر پاک و ہند کی پیداوار ہے، کسی مسلمان نے اس حدیث سے یہ مسئلہ ثابت نہیں کیا کہ اب امت میں شرک نہیں آسکتا، دراصل یہ بت پرستی کی حوصلہ افزائی ہے اور حدیث کی معنوی تحریف ہے، اور مسلمانوں کے اجماعی نظریہ کی خلاف ورزی ہے۔

② اس حدیث مبارکہ میں یہ خطاب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہے، فی الواقع ایسا ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم ﷺ کے بعد شرک نہیں کیا، لہذا آپ ﷺ کا یہ فرمان برحق ہے۔

③ اس حدیث کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے ساری کی ساری امت کے مشرک ہو جانے کا ڈر نہیں، کیونکہ آپ ﷺ کے فرمان گرامی سے ثابت ہے کہ بعض گروہ شرک میں مبتلا ہو جائیں گے، جیسا کہ:

(۱) سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ولا تقوم الساعة حتى تلحق قبائل من أمتي بالمشرکین وحتى تعبد قبائل من أمتي الأوثان .

”اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی، جب تک میری امت کے چند قبائل مشرکوں کے ساتھ نہیں مل جائیں گے اور جب تک چند قبائل قبروں کی پوجا شروع نہیں کر دیں گے۔“ (صحیح مسلم : ۱۴۳/۲، ح : ۱۹۲۰ مختصراً، مسند الامام احمد : ۵/ ۲۷۸، سنن ابی داؤد :

۴۲۵۲، سنن الترمذی : ۲۱۲۹، وقال : صحیح ، سنن ابن ماجہ : ۳۹۵۲)

(ب) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تقوم الساعة حتى تضطرب أليات نساء دوس على ذی الخصلة .

”اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی، جب تک دوس قبیلہ کی عورتوں کی سرینیں ذی الخصلہ (بت) کے ارد گرد چکر نہ لگائیں گے۔“ (صحیح البخاری: ۷۱۱۶، صحیح مسلم: ۲۹۰۶)

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یوں باب قائم فرمایا ہے:

باب تغیر الزمان حتی تعبد الأوثان . ”اس بات کا بیان کہ زمانہ ایسی کروٹ

لے گا کہ بتوں کی پوجا شروع ہو جائے گی۔“

لیکن ہمارے دور کے مشرکین کہتے ہیں کہ شرک کا مسئلہ ہی ختم ہو گیا ہے!

اب اس حدیث کے متعلق علمائے کرام کی آراء ملاحظہ فرمائیں:

① حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (۷۸۵۲-۷۷۳ھ) لکھتے ہیں: ای : لا أخاف

على مجموعكم ، لأنّ الشّرك قد وقع من بعض أمته بعده صلّى الله عليه وسلّم .

”مراد یہ ہے کہ میں تم سب پر شرک کا خوف نہیں کرتا، کیونکہ آپ ﷺ کے بعد آپ کی امت کے

بعض افراد سے شرک کا صدور ہوا ہے۔“ (فتح الباری لابن حجر: ۲۱۱/۳)

② ابن العراق رحمہ اللہ (م ۸۲۶ھ) لکھتے ہیں: ای : مجموعكم ، وإن

كان قد يقع ذلك لبعضهم . ”یعنی تم سب مل کر شرک پر جمع نہیں ہو جاؤ گے، اگرچہ

مسلمانوں میں سے بعض لوگ اس میں مبتلا ہو جائیں گے۔“ (طرح الشریب لابن العرقی: ۳۰۱/۴)

③ علامہ عینی حنفی (۷۶۲-۸۵۵ھ) لکھتے ہیں: معناه : على

مجموعكم ، لأنّ ذلك قد وقع من البعض . ”اس کا معنی یہ ہے کہ میں تم سب

کے شرک میں پڑنے سے نہیں ڈرتا، کیونکہ بعض سے ایسا واقع ہو گیا ہے۔“ (عمدة القاری: ۴۹۱/۱۲)

④ ملا علی القاری حنفی ماتریدی لکھتے ہیں: ای : على مجموعكم أن

تشرکوا بعدی ، لأنّ ذلك قد وقع من بعض . ”اس کا معنی یہ ہے کہ میں تم سب

کے شرک میں پڑنے سے نہیں ڈرتا، کیونکہ بعض سے ایسا واقع ہو گیا ہے۔“

(مرقاۃ المفاتیح : باب فی بیان ہجرت اصحابہ من مکة)

اب ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں کہ بزرگوں کی تعظیم بت پرستی کا باعث بنی ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِي وَثْنًا ، لَعَنَ اللَّهُ قَوْمًا اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ .

”اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنا دینا، اللہ تعالیٰ ان قوموں پر لعنت کرے، جنہوں نے اپنے انبیاء

کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔“ (مسند الحمیدی: ۱۰۲۵، مسند الامام احمد: ۲/۲۶۶، التاريخ

الكبير للبخاری: ۴۷/۳، وسنده حسن)

اس کے راوی سہیل بن ابی صالح کے متعلق حافظ منذری رحمہ اللہ (۲۵۶ھ) لکھتے ہیں:

وثقه الجمهور . ”اسے جمہور نے ثقہ کہا ہے۔“ (الترغیب والترہیب: ۱۱۰/۳)

بوصیری کہتے ہیں: رجاله ثقات . ”اس کے راوی ثقہ ہیں۔“

(اتحاف المہرۃ: ۱۶۴/۴)

ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں: أى : لا تجعل قبري مثل الوثن في تعظيم الناس ، وعودهم للزيارة بعد بدئهم واستقبالهم نحوه في السجود ، كما نسمع ونشاهد الآن في بعض المزارات والمشاهد . ”یعنی (اے اللہ!) میری قبر کو بت کی طرح نہ بنا دینا کہ جس طرح لوگ بتوں کی تعظیم کرتے اور بار بار ان کی زیارت کرتے ہیں اور سجدوں میں اس کی طرف توجہ کرتے ہیں، جیسا کہ ہم اب ہم بعض مزارات و مشاہد میں دیکھتے ہیں۔“

(مرقاۃ الفاتیح لملا علی القاری الحنفی: ۴۵۸/۲)

حافظ الاندلس امام ابن عبد البر رحمہ اللہ (۳۶۸-۴۶۳ھ) لکھتے ہیں:

الوثن : الصنم ، وهو الصورة من ذهب كان أو من فضة ، أو غير ذلك من التمثال ، وكل ما يعبد من دون الله فهو وثن ، صنما كان أو غير صنم ، وكانت العرب تصلي إلى الأصنام وتعبدها ، فخشي رسول الله صلى الله عليه وسلم على أمته أن تصنع كما صنع بعض من مضى من الأمم ، كانوا إذا مات لهم نبي عكفوا حول قبره ، كما يصنع بالصنم ، فقال صلى الله عليه وسلم : اللهم لا تجعل قبري وثنا ، يصلي إليه ويسجد نحوه ، ويعبد ، فقد اشتد غضب الله على من فعل ذلك ، وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يحذر أصحابه وسائر أمته من سوء صنيع

الأمم قبله الذين صلّوا إلى قبور أنبيائهم ، واتخذوا قبلة ومسجدا ، كما صنعت الوثنيّة بالأوثان التي كانوا يسجدون لها ويعظمونها ، وذلك الشرك الأكبر ، فكان النّبىّ صلّى الله عليه وسلّم يخبرهم بما فى ذلك من سخط الله وغضبه ، وأنّه ممّا لا يرضاه خشية عليهم امتثال طرقهم .

”وثن ، بت کو کہتے ہیں اور بت سونے یا چاندی وغیرہ کی مورتی ہوتی ہے، اسی طرح ہر وہ چیز جس کی اللہ تعالیٰ کے علاوہ پوجا کی جائے ، وہ بت ہو یا کوئی اور چیز اسے وثن کہا جاتا ہے، عرب لوگ بتوں کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کرتے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس بات سے ڈر محسوس کیا کہ ان کی امت اسی طرح نہ کرنے لگے، جس طرح گزری ہوئی امتوں نے کیا تھا، وہ یوں کرتے تھے کہ جب ان کا کوئی نبی فوت ہو جاتا تو وہ اس کی قبر پر وہی کام کرتے تھے، جس طرح بت پرست اپنے بتوں کے ساتھ کرتے ہیں، اس لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا، اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنادینا کہ اس کی طرف نماز پڑھی جائے اور سجدے کیے جائیں اور اس کی عبادت کی جائے۔ جن لوگوں نے ایسا کیا تھا، ان پر اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہوا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ اپنے صحابہ اور باقی امت کو ان لوگوں کی بری کرتوتوں سے بچنے کا حکم دیتے تھے، جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھی تھیں اور ان قبروں کو قبلہ اور مسجد بنا لیا تھا، جیسا کہ بت پرستوں نے اپنے ان بتوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا تھا، جن کو وہ سجدے کرتے تھے اور جن کی وہ تعظیم کرتے تھے، یہی شرک اکبر ہے۔ نبی اکرم ﷺ اپنی امت کو ان کاموں میں موجود اللہ تعالیٰ کی ناراضی، غضب کی خبر دے رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ یہ کام ایسے ہیں کہ جن کو آپ ﷺ پسند نہیں کرتے، اس ڈر سے کہ کہیں وہ سابقہ امتوں کے نقش قدم پر ہی نہ چل نکلیں۔“ (التہمید لابن عبد البر : ۴۵/۵، تحقیق سعید احمد اعراب)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لعنة الله على اليهود والنصارى ، اتخذوا قبور أنبيائهم مساجد ، يحذر ما صنعوا .

”یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا تھا، آپ ﷺ ان کے اس فعل سے بچنے کی ترغیب دے رہے تھے۔“

(صحیح البخاری : ۴۳۵، ۴۳۶، صحیح مسلم : ۵۳۱)

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وكانه أنه مرتحل ، فخاف أن يعظم قبره ، كما فعل من مضى ، فلعن اليهود والنصارى إشارة إلى ذم من فعل فعلهم . ”گویا کہ آپ اس دنیا سے کوچ کرنے والے تھے تو آپ ﷺ کو اپنی قبر کی تعظیم کا خوف پیدا ہوا، جیسا کہ پہلے لوگ کرتے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے یہود و نصاریٰ پر لعنت کی، یہ اشارہ کرنے کے لیے کہ جو شخص ان کی طرح کا کام کرے گا وہ مذموم ہوگا۔“ (فتح الباری لابن حجر: ۵۳۲/۱)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا تتخذوا بيوتكم قبورا ، ولا تجعلوا قبری عيداً ، وصلوا عليّ ، فإنّ صلاتكم تبلغني حيث كنتم . ”تم اپنے گھروں کو قبریں مت بناؤ اور میری قبر کو میلہ گاہ مت بناؤ، بلکہ (دور سے ہی) مجھ پر درود پڑھ دیا کرو، کیونکہ تمہارا درود مجھ تک پہنچ جاتا ہے، تم جہاں بھی ہوتے ہو۔“ (مسند الامام احمد: ۳۶۷/۲، سنن ابی داؤد: ۲۰۴۱، واللفظ له، وسندہ حسن)

علامہ مناوی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

معناه النهى عن الاجتماع لزيارته اجتماعهم للعيد ، إمّا لرفع المشقة ، أو كراهته أن يتجاوزوا حدّ التعظيم . ”اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کی قبر کی زیارت کے لیے اجتماع منع ہے، جیسا کہ عید کے لیے اجتماع ہوتا ہے، یا تو مشقت کو ختم کرنے کے لیے یا پھر اس چیز کو ناپسند کرتے ہوئے کہ وہ تعظیم کی حد سے آگے نہ نکل جائیں۔“ (عون المعبود: ۳۲۱/۶-۳۳)

علامہ طیبی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

”آپ نے لوگوں کو اپنی قبر پر اس طرح جمع ہونے سے منع فرمایا، جس طرح کہ عید کے موقع پر سیر و تفریح اور زینت کے ساتھ جمع ہوا جاتا ہے۔ یہود و نصاریٰ اپنے انبیاء کی قبروں پر ایسا کرتے تھے، اس چیز نے ان کو غافل اور سخت دل بنا دیا۔ بت پرستوں کی ایک عادت یہ تھی کہ وہ اپنے مردوں کی تعظیم کرتے رہے، حتیٰ کہ انہوں نے ان کو بت بنالیا، اسی طرف فرمان نبوی میں اشارہ ہے کہ اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنادینا کہ اس کی عبادت کی جائے، اس ممانعت سے مقصود اس ناپسندیدگی کا اظہار ہے کہ لوگ آپ کی قبر کے بارے میں حد درجہ غلو نہ کرنے لگیں، اسی لیے فرمایا کہ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا سخت

غضب ہوا، جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مساجد بنالیا۔“ (مرقاۃ المفاتیح للقاری : ۴/۱)

آج بھی لوگ قبروں میں مدفون اولیاء و صلحاء کو سجدہ کرتے ہیں، ان کو داتا، دستگیر، فریادرس، غوث اعظم، غریب نواز، وغیرہ کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ ان سے مدد طلب کرتے ہیں، ان کے نام پر نذر و نیاز دیتے ہیں، دیکیں پکاتے ہیں، چڑھاوا اور ڈولی چڑھاتے ہیں، ان کے نام پر جانور ذبح کرتے ہیں، بچوں کے سر پر ان کے نام کی چوٹی رکھتے ہیں، کڑے پہنتے ہیں، دودھ کی سبیلیں لگاتے ہیں، کھانا تقسیم کرتے ہیں، ان کی قبر کے سامنے تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں، مجاوری اختیار کرتے ہیں، ان کو نفع و نقصان کا مالک اور صاحب تصرف سمجھتے ہیں، دور یا نزدیک سے ان کو پکارتے اور مشکل میں ان کے نام کی دہائی دیتے ہیں، اولاد اور حاجات طلب کرتے ہیں، ان کو روزی رساں اور عزت و ذلت کا مالک سمجھتے ہیں، ان سے شفا کی امید رکھتے ہیں، پریشانی، دکھ اور تکلیف میں ان سے شکایت کرتے ہیں، ان کی قبر کا طواف، چلہ کشی اور مراقبہ کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ بد بھی رکھتے ہیں کہ اگر نذرانہ پیش نہ کیا تو کاروبار میں نقصان اور مقدمے میں شکست ہو سکتی ہے۔ حصول برکت کے لیے قبر کے ساتھ جسم رگڑتے ہیں۔ صاحب قبر کی عقیدت میں ننگے پاؤں چل کر حاضری دیتے ہیں، گھروں، دوکانوں اور فیکٹریوں میں ان کی تصاویر آویزاں کرتے ہیں، ان کی قبر کو تریاقِ مجرب کا نام دیتے ہیں۔

ان شرکیہ عقائد و اعمالِ سیئہ کے ساتھ ظلماتِ بعضہا فوق بعض، بدعات، خرافات، ہفوات، بیسیوں محرمات اور منکرات نے جنم لیا ہے، مثلاً اولیاء و صالحین کی قبروں کو پختہ کرنا، مخصوص رنگ کے قبة اور گنبد بنانا، ان کے وسیلے سے دعا کرنا، قبر کی مٹی کو خاکِ شفا اور پتھروں کو متبرک اور نافع سمجھنا، قبر کو خلافِ شرع بلند کرنا، اس کو چونا گچ کرنا، اس پر کتبہ لگانا اور خیمہ گاڑنا، شرکیہ اشعار اور مرثیے لکھنا، قبر کے ارد گرد فصیل قائم کرنا، قبر کے قرب میں مسجد تعمیر کرنا، قبر پر غلاف اور چادریں چڑھانا، اگر بتیاں جلانا، موم بتیاں اور چراغ روشن کرنا، برقی پنکھے چلانا، خوشبو چھڑکنا، پھول ڈالنا، جھنڈے گاڑنا، قبر کی تعظیم میں لٹے پاؤں چلنا، اس کی طرف پیٹھ نہ کرنا، قبر کو چومنا اور اس کا بوسہ لینا، اس کی طرف سفر کا قصد کرنا، ذکر کی مجالس و محافل، شب بیداری، اجتماعی نوافل، اجتماعی قرآن خوانی اور فاتحہ خوانی کا اہتمام کرنا۔ بزرگوں کے بارے میں جھوٹے قصے، کہانیاں، جھوٹی کرامات اور روایات بیان کرنا۔ بزرگوں کی روحوں کو حاضر و ناظر سمجھنا وغیرہ۔۔۔

غلام مصطفیٰ ظہیر امن پوری

## قارئین کے سوالات

**سوال :** کیا بالوں کو رنگنا ضروری ہے؟

**جواب :** سلف صالحین کی ایک جماعت سے داڑھی کو نہ رنگنا بھی ثابت ہے، جیسا کہ:

① امام شعبی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا ہے؟ تو آپ رحمہ اللہ نے فرمایا: رأيت أبيض الرأس واللحية .

”میں نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ رضی اللہ عنہ کا سر اور داڑھی سفید تھے۔“

(المستدرک علی الصحیحین للحاکم : ۴/۳۶۵، وسندہ صحیح متصل)

امام حاکم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وهذا إسناد صحيح . ”اس کی سند صحیح ہے۔“

نیز حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی اسے ”صحیح“ کہا ہے۔

② سید اہل الجزیرہ امام عدی بن عدی رحمہ اللہ (م ۱۲۰ھ) فرماتے ہیں:

رأيت جابر بن عبد الله أبيض الرأس واللحية . ”میں نے سیدنا جابر بن

عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ کا سر سفید تھا اور داڑھی بھی سفید تھی۔“

(مسند علی بن الجعد : ۳۳۳، وسندہ صحیح)

③ ابو مودود عبد العزیز بن ابی سلیمان المدنی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

رأيت السائب بن يزيد أبيض الرأس واللحية . ”میں نے سیدنا سائب

ابن یزید (صحابی رسول رضی اللہ عنہ) کو دیکھا، آپ کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے (یعنی وہ خضاب نہیں لگایا

کرتے تھے)۔“ (مصنف ابن ابی شیبہ : ۸/۴۴۵، وسندہ صحیح)

④ الاحف بن قیس ابو بحر التمیمی رحمہ اللہ (م ۶۷ھ، وقیل ۷۲ھ) بیان کرتے ہیں:

قدمت المدينة ، فدخلت مسجدها ، فبينما أنا أصلي إذ دخل رجل طويل ، آدم

، أبيض اللحية والرأس ، محلق ، يشبه بعضه بعضا ، فخرجت فاتبعته ، فقلت : من

هذا ؟ قالوا : أبو ذر . ”میں مدینہ پہنچا، اس کی مسجد میں داخل ہوا، میں نماز پڑھ رہا تھا



کہ اچانک ایک دراز قد آدمی نمودار ہوا، اس کا رنگ گندمی تھا، داڑھی سفید تھی اور سر موٹا ہوا تھا، اس کا بعض حصہ بعض سے مشابہ تھا، میں نکل کر اس کے پیچھے چل دیا، میں نے لوگوں سے پوچھا، یہ کون ہیں؟ انہوں نے بتایا، یہ (صحابی رسول سیدنا) ابو ذر رضی اللہ عنہ ہیں۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۴۴۵/۸، المعرفة والتاریخ للفسوی: ۲۰۶/۱، وسندہ صحیح)

⑤ سیار بن سلامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رأیت أبا برزة أبيض الرأس واللحية. ”میں نے ابو برزہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا، ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔“

(الطبقات الكبرى لابن سعد: ۲۹۹/۴، ۱۹/۷، وسندہ حسن)

⑥، ⑦ فطر بن خلیفہ رضی اللہ عنہ (م ۱۵۳ھ) بیان کرتے ہیں: رأیت مجاهداً شديداً بياض الرأس واللحية، ورأيت سعيد بن جبير أبيض اللحية. ”میں نے امام مجاہد بن جبر تابعی رضی اللہ عنہ کو دیکھا، ان کے سر اور داڑھی کے بال انتہائی سفید تھے اور میں نے امام سعید بن جبیر تابعی رضی اللہ عنہ کو دیکھا، ان کی داڑھی سفید تھی۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۴۴۵/۸، وسندہ صحیح)

⑧ خالد بن ابی عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رأيت سعيد بن جبير أبيض اللحية، ورأيت طاووساً أبيض اللحية. ”میں نے امام سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ اور امام طاووس بن کیسان تابعی رضی اللہ عنہ کو دیکھا، ان کی داڑھی سفید تھی۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ: ۴۴۶/۸، وسندہ صحیح)

⑨ عبد الحمید بن بہرام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رأيت عكرمة أبيض اللحية. ”میں نے عکرمہ (مولیٰ ابن عباس) کو دیکھا، آپ کی داڑھی سفید تھی۔“

(تاریخ بغداد للخطیب: ۴۹/۵، وسندہ صحیح)

⑩ فطر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رأيت الحكم أبيض اللحية. ”میں نے حکم بن عتیبہ تابعی رضی اللہ عنہ کو دیکھا، ان کی داڑھی سفید تھی۔“

(الطبقات الكبرى لابن سعد: ۳۳۱/۶، وسندہ صحیح)

⑪ فطر رضی اللہ عنہ ہی بیان کرتے ہیں: رأيت علي بن ربيعة أبيض اللحية.

”میں نے علی بن ربیعہ تابعی رحمہ اللہ کو دیکھا، ان کی داڑھی سفید تھی۔“

(الطبقات الكبرى لابن سعد: ۲۲۶/۶، وسندہ صحیح)

⑫ عبد اللہ بن جلیج رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: **ورأيت عطاء بن السائب**  
أبيض اللحية. ”میں نے عطاء بن السائب کو دیکھا، ان کی داڑھی سفید تھی۔“

(المعرفة والتاريخ ليعقوب بن سفيان الفسوي: ۳۳۵/۱، وسندہ صحیح)

⑬ نیز فرماتے ہیں: **ورأيت خصيفا أبيض الرأس واللحية.**

”میں نے خصیف کو دیکھا، ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔“

(المعرفة والتاريخ للفسوي: ۳۵۵/۱، وسندہ صحیح)

⑭ نیز بیان کرتے ہیں: **رأيت سلمة بن كهيل أبيض الرأس واللحية**  
، لا يخضب. ”میں نے سلمہ بن کھیل رحمہ اللہ کو دیکھا، آپ کا سر اور داڑھی دونوں سفید

تھے، آپ خضاب نہیں لگاتے تھے۔“ (المعرفة والتاريخ للفسوي: ۳۳۴/۱، وسندہ صحیح)

⑮ **المستمر بن الريان** الزہرائی کہتے ہیں: **رأيت جابر بن زيد أبيض**  
اللحية. ”میں نے امام جابر بن زید رحمہ اللہ (تابعی) کو دیکھا کہ آپ کی داڑھی سفید تھی۔“

(مصنف ابن أبي شيبة: ۴۴۵/۸، وسندہ صحیح)

⑯ **ابوالغصن ثابت بن قيس** رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ: **أنه رأى سعيد بن**  
**المسيب أبيض الرأس واللحية.** ”انہوں نے امام سعید بن مسیب تابعی رحمہ اللہ کو

دیکھا، ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔“ (الطبقات الكبرى لابن سعد: ۱۴۰/۵، وسندہ حسن)

⑰ **فطربان** کرتے ہیں: **رأيت سالما أبيض الرأس واللحية.**

”میں نے سالم رحمہ اللہ کو دیکھا، ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔“

(الطبقات الكبرى لابن سعد: ۱۹۷/۵، وسندہ صحیح)

یہی بات ابوالغصن نے بیان کی ہے۔ (الطبقات الكبرى لابن سعد: ۱۹۷/۵، وسندہ حسن)

⑱ **ابوبکر بن شعیب بن الحجاب** رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: **رأيت أبا صادق**

**أبيض الرأس واللحية.** ”میں نے امام ابوصادق رحمہ اللہ کو دیکھا، ان کا سر اور داڑھی

دونوں سفید تھے۔“ (الطبقات الكبرى لابن سعد : ۲۹۵/۶، وسندہ حسن)

①۹ جریر بن حازم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رأیت أبا رجاء أبيض الرأس واللحية . ”میں نے ابو رجاء کو دیکھا کہ ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔“

(الطبقات الكبرى لابن سعد : ۱۳۹/۷، وسندہ صحیح)

②۰ عطاء بن السائب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: أوّل يوم عرفت فيه عبد الرحمن ابن أبي ليلى ، رأيت شيخا أبيض الرأس واللحية على حمار ، وهو يتبع جنازة . ”پہلے دن جب میں نے امام عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو وہ بوڑھے تھے، ان کا سر اور داڑھی سفید تھے، وہ ایک گدھے پر سوار ہو کر جنازے کے پیچھے جا رہے تھے۔“

(مصنف ابن ابی شیبہ : ۱۰۹/۱۴، وسندہ صحیح)

②۱ امام ابراہیم بن سعید الجوهري رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن محمد بن الاسود رضی اللہ عنہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں: رأيت لا يخضب أبيض الرأس واللحية . ”میں نے ان کو دیکھا کہ وہ خضاب نہیں لگاتے تھے، ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔“

(تاریخ بغداد للخطيب : ۳۳۹/۴، وسندہ صحیح)

②۲ نیز ابو مسعر عبد الاعلیٰ کے بارے میں کہتے ہیں: وكان أبيض الرأس واللحية ، وكان لا يخضب . ”ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے، وہ خضاب نہیں لگاتے تھے۔“ (تاریخ بغداد للخطيب : ۵۶/۵، وسندہ صحیح)

②۳ امام محمد بن اسحاق السراج رضی اللہ عنہ، ابو عمرو الجبھضمی کے بارے میں کہتے ہیں: رأيت ، وكان لا يخضب ، أبيض الرأس واللحية .

”میں نے ان کو دیکھا، وہ خضاب نہیں لگاتے تھے، ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔“

(تاریخ بغداد للخطيب : ۷۹/۶، وسندہ صحیح)

②۴ امام ابراہیم بن سعید الجوهري اور اسماعیل بن ابی الحارث کہتے ہیں:

رأينا الهيثم بن خارجة أبا أحمد أبيض الرأس واللحية .

”ہم نے ابو احمد ہيثم بن خارجہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا، ان کا سر اور داڑھی دونوں سفید تھے۔“

(تاریخ بغداد للخطیب : ۱۹۶/۶ ، وسندہ صحیح)

## فائدہ نمبر ① :

سیدنا عثمان بن عبد اللہ بن موہب بیان کرتے ہیں :

دخلت على أم سلمة ، فأخرجت إلينا شعرا من شعر النبي صلى الله عليه وسلم مخضوبا .

”میں سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا، آپ نے ہماری طرف نبی اکرم ﷺ کے بالوں میں سے ایک بال نکالا، جو کہ خضاب شدہ تھا۔“ (صحیح البخاری : ۵۸۹۷)

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں :  
أما الصّفرة ، فإنّی رأیت رسول الله صلى الله عليه وسلم يصبغ بها ، فأنا أحب أن أصبغ بها .  
”میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ (داڑھی کو) سرخ رنگ کا خضاب لگاتے تھے، لہذا میں بھی اسی رنگ کو پسند کرتا ہوں۔“

(صحیح البخاری : ۵۸۵۱ ، صحیح مسلم : ۱۱۸۷)

ان احادیث سے ثابت ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کے چند بال مبارک سفید بھی تھے اور آپ ﷺ ان کو سرخ یا زرد خضاب بھی لگاتے تھے، جبکہ ایک روایت میں ہے، امام قتادہ تابعی رحمہ اللہ کہتے ہیں :  
سألت أنسا : هل خضب النبي صلى الله عليه وسلم ؟ قال : لا ، إنما كان شيء في صدغيه .

”میں نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ کیا رسول اللہ ﷺ خضاب لگاتے تھے تو انہوں نے جواب دیا، نہیں، آپ ﷺ کی کنپٹیوں پر چند بال سفید تھے۔“

(صحیح البخاری : ۵۸۹۵ ، صحیح مسلم : ۲۳۴۱)

ان احادیث میں جمع و تطبیق یوں ہوگی کہ بعض اوقات نبی اکرم ﷺ کا خضاب لگانا بیان جواز و استحباب کے لیے تھا، اس پر آپ ﷺ نے دوام و ہمیشگی نہیں کی اور سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی نفی اکثر اوقات پر محمول ہے۔ (دیکھیں فتح الباری لابن حجر : ۵/۵۷۲ ، ۱۰/۳۵۴ ، شرح صحیح مسلم

لننوی : ۲/۲۵۹ ، زاد المعاد لابن القيم : ۴/۳۶۷)

## فائدہ نمبر ② :

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا: إِنَّ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى لَا يَخْضِبُونَ ، فخالقوهم .  
 ”یہود و نصاریٰ بالوں کو نہیں رنگتے ، تم (بالوں کو رنگ کر) ان کی مخالفت کرو۔“

(صحیح البخاری: ۵۸۹۹، صحیح مسلم: ۲۱۰۳)

ایک روایت میں ہے: غَيِّرُوا الشَّيْبَ ، وَلَا تَشَبَّهُوا بِالْيَهُودِ .  
 ”تم اپنے بالوں کو رنگا کرو، یہودیوں کے ساتھ تشبیہ اختیار نہ کرو۔“

(سنن الترمذی: ۱۷۵۲، وقال: حسن صحيح ، وسنده حسن)

جب کوئی قرینہ صارفہ نہ پایا جائے تو یہود و نصاریٰ کی مخالفت واجب ہوتی ہے، جبکہ مذکورہ بالا احادیث و آثار میں اس بات کا قرینہ پایا جاتا ہے، جو کہ استحباب کی طرف رہنمائی کرتا ہے، یعنی داڑھی اور سر کے بالوں کو رنگنا مستحب ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے خضاب کو ترک کرنا بھی ثابت ہے، جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔

**فائدہ نمبر ۳:** سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کے سر اور داڑھی کے بال سفید تھے تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

غَيِّرُوا هَذَا بِشْيَءٍ ، وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ . ”ان کو کسی رنگ سے رنگ دو، البتہ سیاہ رنگ سے اجتناب کرو۔“ (صحیح مسلم: ۱۹۹/۲، ح: ۲۱۰۲)

یہ حکم واجب نہیں، بلکہ استحبابی ہے، کیونکہ راوی حدیث سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے سر اور داڑھی کو نہ رنگنا اور سفید رکھنا ثابت ہے، جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے۔

ان احادیث کے بارے میں محدثین کرام کا فہم و عمل یہ بتا دیتا ہے کہ بالوں کو رنگنا ضروری نہیں ہے، کسی محدث نے بالوں کو رنگنے کے بارے میں وجوب کا باب قائم نہیں کیا، خوب یاد رہے کہ محدثین کرام اپنی روایات کا مطلب دوسروں سے بہتر جانتے ہیں۔

کسی مستحب امر کے ساتھ وجوب کا معاملہ کرنا اسے بدعت بنا دیتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صحابہ و تابعین اور محدثین کرام کے فہم و عمل کے مطابق دین پر عمل کرنے کی توفیق سے نوازے!

**سوال:** کیا صرف لفظ ”اللہ“ ذکر ہے؟

**جواب:** فقط لفظ اللہ ذکر نہیں ہے، بعض لوگ دن رات تسبیح پر ”اللہ، اللہ“ کا

ورد کرتے رہتے ہیں، جبکہ قرآن وحدیث میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ائمہ اہل سنت سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہ بدعتِ قبیحہ اور سیئہ ہے۔ یہ وحدت الوجود کا نظریہ رکھنے والے جاہل، ملحد، گمراہ اور بے دین صوفیوں کا ذکر ہے۔

(دیکھیں مجموع الفتاوی لابن تیمیہ: ۱/ ۲۲۵، ۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۳، ۵۵۸، کتاب الرد علی المنطقیین لابن تیمیہ: ۳۵)

اس کے باوجود حنفیوں، دیوبندیوں اور بریلویوں کے نزدیک یہ جائز ہے۔

(دیکھیں تاج التراجم لابن قطلوبغا الحنفی، ملفوظات اشرفیہ: ۱/ ۱۱۴، ۴۸۳، ۵۶۰، ۶۵۹، ۶۶۰، مجالس حکیم الامت: ۲۹۱، الکلام الحسن: ۲/ ۲۱۳، تذکرۃ الرشید از عاشق الہی

دیوبندی: ۲/ ۲۵، العرف الشذی از انور شاہ کشمیری دیوبندی: ۲/ ۴۴)

اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ لوگ فلاسفہ کے نظریات سے کس طرح متفق ہیں۔ واضح رہے کہ اسی طرح ”یا ہو“ ”ہو الا ہو“ اور ”ہو“ بھی ذکر نہیں ہے۔

ہمیں چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کے بتائے ہوئے اذکار پر اکتفا کریں، بہت سے اذکارِ مسنونہ کتبِ احادیث میں موجود ہیں، جو کہ صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔

”بعض الناس“ نے اس مسئلہ کو قرآن وحدیث سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، وہ فقط لفظ ”اللہ“ کے ذکر ہونے کے ثبوت میں یہ آیت کریمہ پیش کرتے ہیں:

﴿قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ﴾ (الانعام: ۹۱)

”آپ کہہ دیں کہ (جس نے کتاب نازل کی ہے، وہ) اللہ (ہے)، پھر آپ ان کو چھوڑ دیں کہ وہ اپنی سرگردانی میں کھیلتے پھریں۔“

حالانکہ اس آیت میں لفظ ”اللہ“ سابقہ آیت میں موجود الفاظ ﴿مَنْ أُنْزِلَ الْكِتَابُ﴾ (یہ) کتاب، یعنی قرآن کس نے نازل کیا ہے؟ کے جواب میں ذکر ہوا ہے۔ چنانچہ یہاں لفظ ”اللہ“ مفرد نہیں ہے، بلکہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اس سے مفرد ذکر کہاں سے ثابت ہو گیا ہے؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ائمہ اہل سنت نے اس آیت سے یہ مسئلہ ثابت نہیں کیا، لہذا یہ قرآن مقدس کی معنوی تحریف ہے، نیز یہ ”بعض الناس“ کی جہالت اور علمی بے بسی پر بین ثبوت ہے۔

اسی طرح وہ ایک حدیث مبارکہ سے بھی استدلال کرتے ہیں، وہ کچھ یوں ہے:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تقوم الساعة ، حتّٰی لا یقال فی الأرض : اللّٰه ، اللّٰه .

”قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی، جب تک زمین میں اللہ، اللہ کہا جانا ختم نہ ہو جائے۔“

(صحیح مسلم : ۸۴/۱ ، ح : ۱۴۸)

اس حدیث سے استدلال باطل ہے، کیونکہ لفظ ”اللہ“ کا تکرار تاکید کے لیے ہے، نہ کہ ذکر کے لیے۔ حافظ نووی رحمہ اللہ شرح کرتے ہوئے اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

أما معنى الحديث فهو أنّ القيامة إنّما تقوم على شرار الخلق ، كما جاء في الرواية الأخرى . ”رہی حدیث کے معنی کی بات تو وہ یہ ہے کہ قیامت بدترین لوگوں پر قائم ہوگی، جیسا کہ دوسری روایت میں موجود ہے۔“ (شرح مسلم للنووی : ۴۸/۱)

یعنی اہل توحید دنیا سے اٹھ جائیں گے، اللہ تعالیٰ کا نام لیوا کوئی نہیں ہوگا، خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا، اس طرح کے برے لوگوں پر قیامت برپا ہوگی۔

علامہ طیبی رحمہ اللہ اس حدیث کا مطلب واضح کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

حتى لا يذكر اسم الله ، ولا يعبد . ”حتی کہ اللہ کا نام نہیں لیا جائے گا، نہ ہی

اس کی عبادت کی جائے گی۔“ (شرح الطیبی : ۱۰۶/۱)

**الحاصل :** فقط لفظ ”اللہ“ ذکر نہیں ہے، بلکہ گمراہ صوفیوں کی ایجاد

کردہ بدعت ہے۔

**سوال :** سجدہ کتنے اعضاء پر کرنا چاہیے؟

**جواب :** سات اعضاء، یعنی ماتھے بشمول ناک، دو ہاتھ، دو گھٹنے اور دو پاؤں پر سجدہ

کرنا واجب ہے، جیسا کہ:

① سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أمرت أن أسجد على سبعة أعظم ، على الجبهة ، وأشار بيده إلى أنفه ، واليدين ، والركبتين ، وأطراف القدمين ... ”مجھے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) حکم

دیا گیا ہے کہ میں سات اعضاء پر سجدہ کروں، ماتھے پر، آپ نے اپنے ہاتھ کے ساتھ ناک کی طرف اشارہ فرمایا، دونوں ہاتھوں، دونوں گھٹنوں اور دونوں پاؤں کے کناروں پر۔۔۔“

(صحیح البخاری: ۸۱۲، صحیح مسلم: ۴۹۰)

② سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: فصلی بنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم حتی رأیت أثر الطین والماء علی جبهه رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم وأرنبته .

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی، حتیٰ کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک اور ناک کے کنارے پر مٹی اور پانی کا نشان دیکھا۔“ (صحیح البخاری: ۸۱۳، صحیح مسلم: ۱۱۶۷)

③ سیدنا ابو جمیر الساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں: انّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان إذا سجد أمکن أنفه وجهته من الأرض .

”نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ فرماتے تو اپنے ناک اور پیشانی مبارک کو زمین پر ٹیکتے تھے۔“

(سنن الترمذی: ۲۷۰، وقال: حسن صحیح، وسندہ حسن)

④ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا صلاة لمن لم يضع أنفه علی الأرض .

”اس شخص کی کوئی نماز نہیں، جس نے اپنے ناک کو زمین پر نہیں رکھا۔“ (سنن الدارقطنی: ۳۴۸/۱، ح: ۱۳۰۳، وسندہ حسن)

ان احادیث مبارکہ کی آل تقلید نے تین طرح سے مخالفت کی ہے:

① فقہ حنفی کی معتبر ترین کتابوں میں لکھا ہے: ولو ترک وضع الیدین والرکبتین جازت صلاته بالإجماع، کذا فی السراج والوہاج .

”اور اگر (نمازی) دونوں ہاتھ اور دونوں گھٹنے زمین پر نہ رکھے تو اس کی نماز بالا جماع جائز ہے، السراج والوہاج میں اسی طرح ہے۔“ (فتاویٰ عالمگیری: ۷۰/۱، العناية فی شرح الہدایة: ۴۹۶/۱)

صاحب ہدایہ نماز جیسے رکن اسلام کا یوں مذاق اڑاتے ہیں:

ووضع الیدین والرکبتین سنة عندنا لتحقق السجود بدوניהما .

”ہاتھوں اور گھٹنوں کو رکھنا ہمارے نزدیک سنت ہے، کیونکہ ان کے بغیر سجدہ ہو جاتا ہے۔“



(الهداية : ٤٧/١)

قارئین کرام! دیکھتے ہیں آپ نے ”فقیہانِ حرم“ کے کرشمے! کس طرح حدیثِ نبوی کے خلاف اجماع و اتفاق کر لیتے ہیں۔ بھلا نماز کے ساتھ اس قسم کا سنگین مذاق و استہزاء کسی اور نے کیا ہے؟ دراصل یہ لوگ اعمال کو ایمان نہیں سمجھتے، اس لیے اس قسم کی کاروائی سے اعمالِ دین کو بے وقعت کرنا چاہتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو قرآن و حدیث کے ساتھ اس طرح کا غیر محتاط رویہ اختیار کرنے سے بچائے۔ آمین!

(۲)، (۳) ابنِ نجیم حنفی لکھتے ہیں: **الاقتصار على الأنف، فعنده يجوز مطلقا، وعندهما لا يجوز إلا لمن عذر بالجبهة، كما صرح به صاحب الهداية.**

”صرف ناک پر سجدہ کرنا امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہر حالت میں جائز ہے، جبکہ امام ابو یوسف و محمد کے نزدیک پیشانی میں کسی تکلیف کی وجہ سے صرف ناک پر سجدہ کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ صاحب ہدایہ نے اس کی صراحت کی ہے۔“ (البحر الرائق لابن نجيم الحنفی : ۳۵۸/۲)

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں: **فإن اقتصر على أحدهما جاز عند أبي حنيفة رحمه الله، وقالوا: لا يجوز الاقتصار على الأنف إلا من عذر.**

”اگر (نمازی) ان دونوں اعضاء (پیشانی اور ناک) میں سے کسی ایک پر اکتفا کر لے تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہے، جبکہ ابو یوسف و محمد بن حسن کا کہنا ہے کہ کسی عذر کی بنا پر ہی صرف ناک پر سجدہ کیا جاسکتا ہے۔“ (الهداية : ٤٧/١)

امام ابن المنذر رحمہ اللہ اس قول کے رد میں لکھتے ہیں: **هذا قول النعمان، وهو قول لا أحسب أحدا سبقه إليه، ولا تبعه عليه.**

”یہ نعمان (بن ثابت ابوحنیفہ) کا قول ہے، میں نہیں جانتا کہ کسی نے ان سے پہلے ایسی بات کہی ہو، نہ ہی بعد میں کسی نے اس بات میں ان کی موافقت کی ہے۔“ (الاورسط لابن المنذر : ۱۷۷/۳)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ، امام ابن المنذر رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **إجماع الصحابة على أنه لا يجوز السجود على الأنف وحده.**

”اس بات پر صحابہ کرام کا اجماع ہے کہ اکیلے ناک پر سجدہ کرنا کفایت نہیں کرتا۔“

(فتح الباری لابن حجر: ۲/۲۹۶)

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ (م ۲۲۰ھ) لکھتے ہیں: فی قول أبی حنیفة أنه یجزئ أن یسجد علی أنفه دون جبهته ، وهذا قول یشکک الحدیث الصّحیح والإجماع .  
 ”امام ابوحنیفہ کے قول میں پیشانی کے بغیر صرف ناک پر سجدہ ہو جاتا ہے، لیکن یہ قول صحیح حدیث اور اجماع کے مخالف ہے۔“ (المغنی لابن قدامة: ۲/۱۹۷)

لہذا یہ کہنا کہ صرف ناک پر سجدہ جائز ہے، یہ صحیح احادیث اور اجماع امت کی خلاف ورزی ہے۔  
 سجدہ جو نماز کا بنیادی رکن ہے، اس کا حلیہ بگاڑنے والی بات ہے۔

**الحاصل:** سجدہ سات اعضاء پر کرنا واجب ہے، صرف پیشانی یا صرف ناک پر سجدہ کرنا دین اسلام سے مذاق اور ناجائز کام ہے۔



حدیث کو قرآن پر پیش کرنا رافضیوں کا طریقہ ہے۔ ابن شہاب دین  
 ایک مشہور غالی و رافضی شیعہ لکھتا ہے: وقد دلت الأخبار المتواترة علی وجوب عرض الروایات علی الكتاب والسنة ، وأن ما خالف الكتاب منها یجب طرحه وضربه علی الجدار . ”متواتر احادیث اس بات پر دلیل ہیں کہ روایات کو کتاب و سنت پر پیش کرنا واجب ہے، ان میں سے جو قرآن کے خلاف ہو، اسے چھوڑنا اور دیوار پر دے مارنا واجب ہے۔“  
 (الاصول من الکافی: ۱/۱۵۳)

وہ متواتر احادیث کسی رافضی کی پٹاری میں ہوں گی۔ محدثین کرام نے بالاتفاق اس موضوع کی تمام روایات کو ”موضوع و من گھڑت“ اور ”ضعیف“ کہا ہے۔ ائمہ دین کا اتفاقی فیصلہ ہے کہ کوئی صحیح حدیث قرآن کریم کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتی، بلکہ یہ دعویٰ ایسے دعویداروں کی اپنی کم نہی ہے۔  
 یہ تو ایک رافضی کی بات تھی، لیکن صدافسوس ہے کہ اپنے آپ کو اہل سنت میں سے شمار کرنے والے بہت سے ”علماء“ اور عوام اسی کی رٹ لگاتے سناتی دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ فرمائے!



حافظ ابو یحییٰ نور پوری

صحیح بخاری کا مطالعہ اور فقہانہ انکارِ حدیث

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی منقبت

میں حدیثِ براء بن عازب رضی اللہ عنہ



## اعتراض نمبر ۶ : ”(۴) یہ صلح نامہ چار دفعات پر مشتمل تھا، جیسا کہ میں

نے بن القوسین لکھ دیا ہے۔ عبید اللہ نے ان میں سے بس کچھ تیسری اور چوتھی دفعہ کا ذکر کیا ہے، وہ بھی غلط، کیونکہ چوتھی دفعہ یہ تھی کہ مکہ والوں میں سے کوئی شخص مدینہ چلا جائے تو اسے آپ اپنے پاس نہ رہنے دیں گے اور مسلمانوں میں سے کوئی شخص اسلام چھوڑ کر مکہ آجائے تو اسے ہم سے طلب نہ کریں گے۔ عبید اللہ نے اسے ٹھیک بیان نہیں کیا۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ : ۷۴/۱)

**جواب :** ① قارئین کرام! کلام میں اجمال و تفصیل کا ہونا ایک مسلم امر ہے، یعنی بعض دفعہ ایک شخص ایک واقعہ کو اجمالاً اختصار سے بیان کرتا ہے اور دوسری دفعہ اس کو تفصیل سے کھول کر بیان کر دیتا ہے۔ اگر سب شروط کا ذکر عبید اللہ بن موسیٰ نے نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شروط انہوں نے حذف کی ہیں، بلکہ انہوں نے اپنے استاذ سے سنی ہی اسی طرح تھیں۔

جو دفعات اس معاہدے میں ثابت ہیں، وہ دوسری صحیح احادیث میں موجود ہیں، لہذا یہ تفصیل دوسری حدیثوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس حوالے سے ہم ایک مثال پیش کر کے بات سمجھاتے ہیں:

سورۃ اعراف (۱۱-۱۲) وغیرہ میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا۔ ابلیس کے سوائے سب نے سجدہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے سجدہ نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا، مجھے تُو نے آگ سے پیدا کیا اور اُسے مٹی سے، لہذا میں اسے سجدہ نہیں کر سکتا۔ جبکہ سورۃ بقرہ (۳۴) وغیرہ میں شیطان کے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کا ذکر تو ہے، لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان سے اس بارے میں پوچھ گچھ بھی کی تھی۔

کیا کسی منکرِ قرآن کا سورۃ بقرہ کی مذکورہ آیت پر یہ اعتراض کرنا صحیح ہوگا کہ وہ (معاذ اللہ) ناقص ہے؟ اگر وہاں یہ اعتراض کرنا بے عقلی کی دلیل ہے اور اس سے کفر لازم آجاتا ہے تو حدیثِ رسول ﷺ بھی تو وحی ہے، اس پر اس طرح کے بے تکلف اعتراضات کرنا ایک مسلمان کو کیسے روا ہے؟

② رہی بات غلط بیان کرنے کی تو گزشتہ اعتراضات کے جواب میں ہم نے بڑی تفصیل

سے واضح کر دیا ہے کہ وہ دراصل میرٹھی صاحب کی کم علمی پر مبنی اپنی غلطیاں ہیں، جنہیں وہ ”چور بھی کہے چور چور“ کا مصداق بن کر عبید اللہ بن موسیٰ کے ذمہ تھوپنا چاہتے ہیں۔ تفصیل کے لیے اعتراض نمبر ۴ کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

## اعتراض نمبر ۴ : ”(۵) عبید اللہ کی روایت میں ہے: فَلَمَّا

دخلها ومضى الأجل. سیاق روایت سے اس کا مطلب یہ نکل رہا ہے کہ حدیبیہ کے سال ہی سن ۶ ہجری میں آپ صلح نامہ کے مطابق مکہ میں داخل ہوئے، حالانکہ یہ غلط ہے۔ اس سال تو آپ صلح نامہ کے مطابق حدیبیہ سے ہی مدینہ واپس ہو گئے تھے۔ سن ۷ ہجری میں عمرۃ القضاء کے لیے مع اصحاب مکہ تشریف لے گئے ہیں۔۔۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۷۴/۱)

**جواب :** میرٹھی صاحب نے ”تحقیق و تنقید“ کے نام سے خام مال اپنی کتاب میں لوڈ کیا ہے۔ بالکل یہی اعتراض پہلے بھی میرٹھی صاحب نے کیا تھا، جسے ہم اعتراض نمبر ۳ کے تحت ذکر کر چکے ہیں، لیکن اگلے ہی صفحہ پھر وہی اعتراض دہرایا ہے۔

قارئین خود فیصلہ کریں کہ کیا تحقیق و تنقید اسی روش کا نام ہے؟ نامعلوم میرٹھی صاحب کا حافظہ ہی کام چھوڑ گیا تھا یا پھر انہوں نے محض کتاب کا حجم بڑھانے کے لیے ایسی کاروائی کی ہے؟

## تحقیق و تنقید یا بازی گری؟

قارئین کرام یہ دیکھتے آرہے ہیں کہ میرٹھی صاحب نے صحیح بخاری کی اس متفقہ طور پر صحیح حدیث پر مذکورہ سارے اعتراضات صرف عبید اللہ بن موسیٰ رضی اللہ عنہ کو آڑ بنا کر کیے ہیں۔ ان کو رافضی، بدعتیہ، غالی شیعہ، عیار، دھوکہ باز، غلوکار، کج رو اور نامعلوم کیا کیا کہا ہے۔ لیکن گر گٹ کی طرح ان کا رنگ بدلنا دیکھیں کہ اس پراپرٹی چوٹی کا پورا زور صرف کر کے اب خود ہی اقرار کر لیا ہے کہ:

”لیکن ان غلط بیانیوں کا ذمہ دار عبید اللہ بن موسیٰ انہیں، کیونکہ حنین بن شعیب (مسند: ۲۹۸/۴) اور محمد بن یوسف فریابی نے بھی اسرائیل سے اس طرح کی روایت کی ہے۔ (سنن دارمی، کتاب السیر)، پس یہ غلط بیانیاں اسرائیل بن یونس کی ہیں۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۷۴/۱)

معلوم ہوا کہ قصور نہ بے چارے عبید اللہ بن موسیٰ کا ہے نہ ہی اسرائیل بن یونس کا، بلکہ ان منکرین حدیث کی اپنی عقل کا ہے، جو حدیث اور اجماع امت کو تسلیم کرنے کی بجائے اس طرح کی بے

وقوفیاں ہانکتی رہتی ہے۔ اب میرٹھی صاحب کے معتقدین کو چاہیے کہ وہ تمام القابات جو اس حدیث پر اعتراض کرنے کے لیے انہوں نے عبید اللہ بن موسیٰ کو دیئے تھے، خود ہی اپنے پیشوا کے ساتھ فٹ کر لیں، کیونکہ خود انہوں نے اعتراف کر لیا ہے کہ یہ غلطیاں عبید اللہ بن موسیٰ کی نہیں، لہذا ان کی ساری کوشش بالکل رائیگاں اور فضول رہی ہے۔

انصاف پسند لوگ خود ہی سوچیں کہ یہ تحقیق و تنقید ہے یا بازی گری؟

ع دھوکہ دیتے ہیں یہ بازی گر کھلا !

**اعتراض نمبر ۸ :** ”دوسرا قصہ دختر حمزہ کا ہے کہ مکہ سے روانگی کے وقت وہ

یا عَمّ، یا عَمّ پکارتی ہوئی آپ کے پیچھے ہولی اور علی نے اسے حضرت فاطمہ کے حوالے کر دیا، پھر مدینہ پہنچنے پر اس کی کفالت کے تین دعوے دار ہوئے۔ علی اور ان کے بڑے بھائی جعفر اور زید بن حارثہ۔ آپ نے اس کا فیصلہ حضرت جعفر کے حق میں فرمایا، کیونکہ ان کی بیوی اسماء بنت عمیس اس لڑکی کی خالہ تھیں اور آپ نے تینوں حضرات کے متعلق ایک ایک بات کہی، جسے سن کر ان پر وجد طاری ہو گیا اور فرط مسرت سے رقص کرنے لگے۔ علی سے آپ نے اُنْت منّی وَاَنَا منک، زید سے اُنْت اُخونا وَاَنَا منک، جعفر سے اُشْبِہْتَ بى خَلْقًا وَخَلَقًا فرمایا تھا۔

یہ قصہ ابواسحاق نے ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی سے سنا تھا، جو قطعاً گھڑا ہوا اور شروع سے آخر تک محض جھوٹ ہے۔ اسماء بنت عمیس اور سلمیٰ بنت عمیس دونوں بہنیں قدیمۃ الاسلام صحابیہ ہیں۔ اسماء کی شادی حضرت جعفر بن ابی طالب سے ہوئی تھی اور حضرت اسماء بنت ابی طالب اپنے شوہر حضرت جعفر کے ساتھ حبشہ ہجرت کر کے گئیں، پھر سن ۷ ہجری میں ان ہی کے ساتھ حبشہ سے مدینہ آئیں اور حضرت سلمیٰ بنت ابی طالب اپنے شوہر حضرت حمزہ کے ساتھ مدینہ ہجرت فرما گئیں۔ حضرت حمزہ کی بیٹی، جس کا اس روایت میں ذکر ہے، یقیناً سلمیٰ بنت عمیس کے لطن سے تھی۔ اس لڑکی کے والدین، یعنی حضرت حمزہ سلمیٰ نے جب مکہ سے ہجرت کی ہے تو کیا وہ اپنی کمسن بیٹی کو مکہ میں چھوڑ سکتے تھے؟ حضرت حمزہ غزوہ احد میں شہید ہو گئے، ان کے بعد حضرت شداد بن الہاد لیشی رضی اللہ عنہ سے سلمیٰ کا نکاح ہو گیا۔ عبداللہ بن شداد بن الہاد مشہور تابعی سلمیٰ کے لطن سے ہی پیدا ہوئے تھے اور شداد بن الہاد مہاجر صحابی ہیں۔ بقول ابن سعد غزوہ خندق اور بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے تھے۔

الغرض حضرت حمزہ کی یہ بیٹی جس کا اکثر محدثین نے عمارہ نام بنایا ہے، حضرت حمزہ کے بعد باپ کے سایہ سے محروم ہو گئی تھی، لیکن اس کی ماں سلمیٰ بنت عمیس تو موجود تھی۔ ماں کے ہوتے ہوئے خالہ کی کفالت کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے متعلق ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی سے جو قصہ مروی ہے، جس کی ان دونوں نے بقول ابواسحاق سبیعی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ اس کے برخلاف خود حضرت علی سے نافع بن عجمیر نے روایت کی ہے۔۔۔

سنداً یہ حدیث مضطرب ہے اور اس کا راوی نافع بن عجمیر مجہول الحال ہے۔ اس پر بھی وہی اشکال وارد ہوتا ہے کہ دختر حمزہ کا مکہ میں رہ جانا غیر معقول ہے اور بالفرض وہ رہ ہی گئی تھی اور عمرۃ القضاء کے بعد زید بن حارثہ اسے جا کر لائے تھے تو مدینہ میں اس کی والدہ سلمیٰ بنت عمیس تو موجود تھیں۔ ان کے ہوتے ہوئے خالہ کی کفالت بے معنی بات تھی۔

بہر کیف حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کا یہ قصہ نری غپ شپ ہے اور عبید اللہ بن موسیٰ نے تو اسے حضرت براء بن عازب کی طرف منسوب کر کے کڑوا کر یلا پھر نیم چڑھا بنا دیا اور دروغ گوئی کو دو آتشہ کر دیا تھا۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۷۷-۷۴/۱)

**جواب:** ① میرٹھی صاحب نے صحیح بخاری کی صحت پر امت مسلمہ کے اتفاق کو لات مارنے کے لیے جو بہانہ بنایا ہے، وہ بالکل بودا ہے۔ ان کے اعتراض کا حاصل دو باتیں ہیں، اول یہ کہ ہجرت کے وقت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی سلمیٰ بنت عمیس نے اپنی بیٹی کو مکہ میں کیسے چھوڑ دیا تھا اور ثانی یہ کہ ماں کے ہوتے ہوئے خالہ کی کفالت کا سوال کیسے پیدا ہوتا ہے؟

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: وهذا يشعر بأن أمها إنما لم تكن أسلمت... وإما أن تكون ماتت... ”اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس (دختر حمزہ) کی ماں یا تو (اس وقت تک) مسلمان نہیں ہوئی تھی یا پھر وہ فوت ہو چکی تھی۔“ (فتح الباری لابن حجر: ۵۰۶/۷)

اس سے میرٹھی صاحب کے دونوں اعتراض رفع ہو گئے ہیں۔ پہلے حمزہ رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے وقت اپنی بیٹی کو مکہ میں اس لیے چھوڑا تھا کہ اس کی ماں ابھی مسلمان نہیں ہوئی تھی اور بچی ابھی چھوٹی تھی۔

پھر ماں کے ہوتے ہوئے خالہ کی کفالت کا بھی سوال اسی لیے پیدا ہوا کہ ماں اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئی تھی، اب لڑکی باشعور ہو رہی تھی، لہذا آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ نے اس بات کو

مناسب نہیں سمجھا کہ وہ اپنی مشرک ماں کے ساتھ رہے۔ یا ماں مسلمان ہو کر فوت ہو چکی تھی، لہذا خالہ کو کفالت سونپنا پڑی۔

اب میرٹھی صاحب کے معتقدین کو چاہیے کہ وہ اس صحیح حدیث پر میرٹھی صاحب کے ان دو اعتراضات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے قدیمۃ الاسلام ہونا تو دور کی بات ہے، ہجرت مدینہ کے وقت تک بھی سلمیٰ بنتِ عمیس کا مسلمان ہونا ثابت کر دیں اور پھر فتح مکہ کے وقت ان کا مسلمان ہو چکنا اور زندہ رہنا کسی مستند ذریعہ سے دکھادیں۔ ورنہ جان لیں کہ یہ سب بہانے ہیں، حقیقت نہیں۔

② ہبیرہ بن یریم اور ہانی بن ہانی دونوں ثقہ راوی ہیں۔ ان پر تفصیلی بحث ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں، پھر وہ دونوں صحیح بخاری کی سند میں موجود بھی نہیں ہیں، لہذا اپنی مرضی سے ان کو یہاں ٹھونس کر اور ان پر جرح کر کے اس قصہ کو گھڑا ہوا اور جھوٹ قرار دینا بجائے خود کائنات کا بدترین جھوٹ ہے اور منکرین حدیث کی جہالت و لاعلمی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

③ نافع بن عجمیر کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اس قصہ کو روایت کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ ابواسحاق کا سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے اسے بیان کرنا غلط ہے، بلکہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ قصہ مروی ہے اور سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بھی۔

رہا نافع بن عجمیر کو مجہول الحال کہنا تو یہ اور بڑی جہالت ہے، کیونکہ بہت سے محدثین مثلاً ابوالقاسم بغوی، ابونعیم، ابن حبان وغیرہ نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے۔ (تہذیب التہذیب لابن حجر: ۴۰۸/۱۰) صحابہ کرام سب کے سب عادل و ضابط ہیں، صحت سند کے لیے ان کے حالات معلوم کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔

بالفرض ان کو صحابی تسلیم نہ کیا جائے تو بھی وہ ثقہ ہیں، کیونکہ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے ان کو ثقات میں ذکر کیا ہے اور امام حاکم رحمہ اللہ (المستدرک: ۲۱۱/۳) ان کی حدیث کے بارے میں ”صحیح علی شرط مسلم“ فرما گئے ہیں، جو کہ ان کی توثیق ہے، حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی وثِّقَ کہہ کر ان کی توثیق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ (الکاشف: ۵۷۸۴)

معلوم ہوا کہ میرٹھی صاحب کا یہ اعتراض بھی محض جہالت پر مبنی ہے۔

④ نافع بن عجمیر کی حدیث کو سنداً ”مضطرب“ کہنا بھی بہت بڑی بے وقوفی ہے، کیونکہ

میرٹھی صاحب کے نزدیک نافع بن عیمر ”مجهول الحال“ ہیں، لہذا ان کی روایت ہی ”ضعیف“ ہے، جبکہ اضطراب ہمیشہ ایسی سندوں میں ہو سکتا ہے جو صحت میں برابر ہوں، ایک ”صحیح“ اور ایک ”ضعیف“ سند کسی صورت بھی ایک دوسرے کے مقابلے میں ”مضطرب“ نہیں کہلا سکتیں۔

حافظ ابن الصلاح رحمہ اللہ اصول حدیث کے بارے میں اپنی مشہور زمانہ کتاب میں لکھتے ہیں:

المضطرب من الحديث : هو الذى تختلف الرواية فيه ، فيرويه بعضهم على وجه وبعضهم على وجه آخر مخالف له ، وإنما نسّميه مضطربا إذا تساوت الروايتان ، أما إذا ترجحت إحداهما بحيث لا تقاومها الأخرى بأن راويها أحفظ أو أكثر صحة للمروى عنه أو غير ذلك من وجوه التّرجيحات المعتمدة فالحكم للراجحة ، ولا يطلق عليه حينئذ وصف المضطرب ولا له حكمه .

”مضطرب حدیث وہ ہوتی ہے، جس کی روایت مختلف ہو جائے، بعض راوی ایک طرح بیان کریں اور بعض اس کے خلاف کسی اور طرح بیان کریں۔ ہم حدیث کو مضطرب صرف اسی وقت کہتے ہیں، جب دونوں (مختلف روایات قوت میں) برابر ہوں۔ لیکن جب ایک روایت دوسری روایت پر ترجیح پا جائے اور دوسری اس کا مقابلہ نہ کر سکے، اس طرح کہ ایک کا راوی زیادہ حافظہ والا اور اپنے استاذ سے زیادہ صحبت رکھنے والا ہو یا قابل اعتماد وجوہ ترجیح میں سے کوئی موجود ہو تو حکم رائج روایت کا ہی ہوگا۔ اس وقت ہم اس حدیث پر مضطرب کے وصف کا اطلاق نہیں کریں گے، نہ ہی اس کا حکم مضطرب والا ہوگا۔“ (مقدمة ابن الصلاح : ص ۵۵)

قارئین کرام! جب دوا ایسے ثقہ راویوں کی ایک دوسرے کے مخالف روایت بھی ”مضطرب“ نہیں ہو سکتی، جن میں سے ایک حافظے میں دوسرے سے بڑھ کر ہو تو اس راوی کی روایت ثقہ راویوں کی روایت کے مقابلے میں آکر ”مضطرب“ کیسے ہو سکتی ہے، جس کو خود میرٹھی صاحب ”مجهول الحال“ قرار دے رہے ہیں؟

یہ ہے میرٹھی صاحب کا مبلغ علم اور وہ اعتراضات کرتے ہیں امت مسلمہ کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر! بلاشبہ انکار حدیث کا بڑا سبب اصول حدیث سے لاعلمی ہے۔ کسی دانشور نے سچ کہا ہے:

”لَوْ كُنَّا نَعْلَمُ مَا فِي قُلُوبِ النَّاسِ لَمَّا يَجْهَلُونَ .“



مخالف ہو جاتے ہیں۔“

”میں نہ مانوں“ کا علاج تو کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ منصف مزاج آدمی کے سامنے سارے حقائق رکھ دیئے گئے ہیں۔ ہر ذی شعور سمجھ سکتا ہے کہ میرٹھی صاحب کا کبھی عبید اللہ بن موسیٰ کو ”دروغ گو“ وغیرہ کہہ کر مطعون کرنا اور کبھی تھوک چاٹ کر فوراً ساری ”غلط بیانیوں“ کا ذمہ دار اسرائیل بن یونس کو بنانا محض ہٹ دھرمی پر مبنی ہے، تحقیق و تنقید قطعاً نہیں۔

قارئین کرام! ہماری اپیل ہے وہ دلائل کو پرکھیں، حقائق کو دیکھیں اور حق کے پیرو بنیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق سمجھنے اور اس پر ڈٹ جانے کی توفیق عطا فرمائے! آمین!

حافظ ابو یحییٰ نور پوری



وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا  
إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ...

کے شانِ نزول کے متعلق حدیث جابر رضی اللہ عنہ

قارئین کرام! صحیح بخاری (۴۸۹۹، ۲۰۶۴، ۲۰۵۸، ۹۳۶) صحیح مسلم (۸۶۳) وغیرہ کی مذکورہ بالا صحیح حدیث آپ نے بارہا سنی ہوگی اور امت مسلمہ بالاتفاق اسے صحیح ہی سمجھتی آئی ہے۔ صحابہ کرام سے لے کر آج تک کے تمام مسلمان اس صحیح حدیث کے مطابق سورہ جمعہ کی آیت (۱۱/۶۲) کی تفسیر یہی کرتے رہے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ایک دفعہ جمعہ کا خطبہ ارشاد کر رہے تھے کہ ایک تجارتی قافلہ مدینہ میں داخل ہوا۔ شروع میں جس طرح نماز میں ایک دوسرے کے ساتھ کلام کی گنجائش تھی، بعد میں کلام کی ممانعت ہوئی، اسی طرح خطبہ میں بھی اتنی سخت پابندیاں عائد نہیں کی گئی تھیں، لہذا سامعین میں سے بارہ آدمیوں کے علاوہ باقی تمام لوگ اس قافلے کی طرف چلے گئے، خطبہ کی کوئی پرواہ نہ کی، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور مسلمانوں کو سمجھا دیا کہ جمعہ کا خطبہ تمہارے لیے تجارت اور وغیرہ سے بہتر ہے۔ رہا تمہارا یہ اندیشہ کہ جمعہ پڑھتے پڑھتے ہم سامانِ خورد و نوش سے محروم ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ سب سے بڑا رزاق ہے، وہ تمہیں ضرور سب کچھ مہیا کر دے گا، لہذا آئندہ ایسا کرنا تمہارے لیے قابلِ مواخذہ جرم ہوگا۔

لیکن چودہ سو سال سے ساری امت مسلمہ کی اس متفقہ تفسیر اور پھر صحیح بخاری و مسلم کی صحت

پرپوری امت کے اجماع و اتفاق کے خلاف پندرہویں صدی میں پیدا ہونے والے شبیر احمد ازہر میرٹھی صاحب اس پر جاہلانہ، بے وقوفانہ اور ہٹ دھرمانا اعتراضات کر کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک کے تمام محدثین و مفسرین کو جاہل و اعظا اور گپیں ہانکنے والے راوی قرار دے کر اس کا انکار کر دیا ہے، ان کی بکواسات پیش خدمت ہیں:

”ان وجوہ کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث باطل ہے اور اس میں جو قصہ مذکور ہے قطعاً بے اصل ہے۔ جاہل و اعظموں اور اناپ شناپ بکنے والے راویوں نے قرآن کریم کی ہر آیت کا الگ الگ شان نزول بیان کرنے کی جو بے ہودہ بدعت تابعین و اتباع تابعین کے دور میں پھیلا دی تھی، وہی اس قصہ کے گھڑنے کا باعث ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ: ۸۲/۱)

آئیے ان وجوہ کا جائزہ لیں، جن کہ بنا پر میرٹھی صاحب نے اس حدیث کو باطل اور بے ہودہ قرار دیا ہے، تاکہ قارئین کو میرٹھی صاحب کی جہالت و حماقت کا یقین بھی ہو جائے اور اس بات کا کچھ اندازہ بھی ہو جائے کہ صحیح بخاری صحیح مسلم کی صحت پر امت مسلمہ کا اتفاق قطعی طور پر ناقابل تسخیر ہے۔

لیکن پہلے ہم میرٹھی صاحب کی اس بات کا جواب دینا چاہیں گے کہ ان کے بقول تابعین اور تبع تابعین کے دور میں جو ”بدعت“ شروع ہوئی تھی، وہ اس حدیث کے گھڑے جانے کا سبب بنی، حالانکہ یہی اس آیت مبارکہ کا یہی شان نزول صحابہ کرام میں بھی معروف تھا، چنانچہ صحیح مسلم میں موجود ہے:

عن أبي عبيدة عن كعب بن عجرة: قال دخل المسجد وعبد الرحمن بن أمّ الحكم يخطب قاعداً، فقال: انظروا إلى هذا الخبيث، يخطب قاعداً، وقال الله تعالى: ﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا﴾

”ابوعبیدہ (بن عبد اللہ بن مسعود) بیان کرتے ہیں کہ صحابی رسول سیدنا کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے، عبد الرحمن بن ام الحکم بیٹھ کر خطبہ دے رہا تھا۔ آپ نے فرمایا، اس خبیث کی طرف دیکھو کہ یہ بیٹھ کر خطبہ دے رہا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا﴾ (اے نبی! جب وہ تجارت یا کھیل دیکھتے ہیں تو اس کی

طرف دوڑ پڑتے ہیں اور آپ کو کھڑا چھوڑ دیتے ہیں)۔“ (صحیح مسلم: ۸۶۴)

یہ ہے میرٹھی صاحب کے مطالعہ کی وسعت کا عالم! ان کو یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ اس آیت

مبارک کی یہ تفسیر تابعین اور تبع تابعین کے دور میں شروع نہیں ہوئی، بلکہ یہی تفسیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی کرتے رہے ہیں۔ ایسے کم علم شخص کو اس طرح کے خالص علمی کاموں میں پڑنے کی بھلا کیا ضرورت تھی، جو بجائے اس کی عزت افزائی کے قیامت تک ذلت افزائی کا سبب بن گئے ہیں؟ تابعین و تبع تابعین اور محدثین پر طعن و تشنیع کرنے والے شخص کو اپنا علمی معیار بہت اچھا نہیں تو کم از کم گزارے کے قابل ضرور بنالینا چاہیے تھا!

## ”روایتی“ اعتراضات

میرٹھی صاحب نے اس حدیث پر روایت کے لحاظ سے جو اعتراضات کیے ہیں، وہ درحقیقت ان کے روایتی اعتراضات ہیں، علمی نہیں۔ ان کی علمی حیثیت ملاحظہ فرمائیں:

”پس حصین بن عبد الرحمن سے یہ حدیث“ **اعتراض نمبر ①** :

(۱) زائدہ (۲) خالد بن عبد اللہ الطحان (۳) جریر بن عبد الحمید (۴) ہشیم بن بشیر اور (۵) عبد اللہ بن ادریس نے روایت کی ہے۔ ان پانچوں کی روایت میں متن و اسناد کے لحاظ سے اختلاف ہے۔ متن کا اختلاف یہ ہے کہ زائدہ کی روایت کے مطابق تجارتی قافلہ کی آمد پر بارہ شخصوں کے علاوہ تمام صحابہ کرام نماز پڑھنے کی حالت میں آپ کو چھوڑ کر نماز توڑ کر نکل گئے تھے اور خالد و جریر و عبد اللہ بن ادریس کی روایت کے مطابق خطبہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس وقت آپ خطبہ دے رہے تھے۔ اسی پر ہشیم کی روایت محمول ہے، اس میں صراحۃً نہ خطبہ کا ذکر ہے نہ نماز کا، بس یہ ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے تھے۔

اصولاً چار ثقہ راویوں کی روایت ایک ثقہ کی روایت پر رائج ہے اور باور کرنا چاہیے کہ زائدہ کو وہم ہو گیا تھا کہ خطبہ کی بجائے نماز کا ذکر کر دیا۔ (”صحیح بخاری کا مطالعہ“ : ۷۹/۱ - ۸۰)

**جواب :** ① قارئین کرام! یہ تھی پہلی وجہ جس کی بنا پر میرٹھی صاحب نے اس بالاتفاق صحیح حدیث کا انکار کیا ہے، لیکن اس اعتراض کا باعث میرٹھی صاحب کی علمی تنگدستی ہے۔

اپنے بڑے ثقہ راوی یا زیادہ ثقہ راویوں کے خلاف کسی ثقہ راوی کی روایت کو ”شاذ“ کہتے ہیں۔ اس کی تعریف محدثین کی زبانی سن لیں اور پھر دیکھیں کہ زائدہ کی روایت کو ”شاذ“ کہنا اصول حدیث کی موافقت ہے یا مخالفت! حافظ ابن الصلاح رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے

ہوئے لکھتے ہیں: ليس من الشاذ أن يروى الثقة ما لا يروى غيره ، إنما الشاذ أن

يروى الثقة حديثا يخالف ما روى الناس . ”شاذ یہ نہیں کہ ثقہ راوی وہ (حدیث یا

الفاظ) بیان کرے جو دوسرے بیان نہیں کرتے ، بلکہ شاذ تو صرف یہ ہے کہ ثقہ راوی ایسی حدیث بیان کرے جو دوسرے (ثقہ) لوگوں کی روایت کردہ کے مخالف ہو۔“

معلوم ہوا کہ اگر ایک ثقہ راوی اور زیادہ ثقہ راویوں کی بیان کردہ بات میں اختلاف ہو تو ایک ثقہ راوی کی بات ”شاذ“ اور غیر مقبول ہوگی ، لیکن اگر سب کی بات ایک ہی ہو ، اس میں کوئی حقیقی اختلاف نہ ہو ، بلکہ صرف ایک آدمی کو اپنی کم علمی و کم فہمی کی وجہ سے اس میں اختلاف نظر آتا ہو تو اسے باطل کہنا خود باطل ہوگا۔ تمہید کے طور پر اتنی بات ذہن نشین کر لینے کے بعد ہم قارئین کو بتانا چاہتے ہیں کہ زائدہ کی روایت اور ان کے علاوہ چار راویوں کی روایت ایک ہی ہے ، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

وہ اس طرح کہ زائدہ نے خطبہ کی جگہ نماز کا لفظ بولا ہے اور یہ اختلاف نہیں ، بلکہ اتفاق ہے ، کیونکہ: (۱) خطبہ نماز جمعہ کا ہی حصہ ہے ، نماز ظہر کی دو رکعت کم کر کے ان کی جگہ خطبہ رکھا گیا ہے ، گویا خطبہ انہی دو رکعتوں کا بدل ہے ، جو جمعہ کے دن نماز ظہر سے ختم کی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نماز کی طرح خطبہ جمعہ میں بھی آپس کی کلام اور دیگر مصروفیات مثلاً خرید و فروخت وغیرہ سے سختی کے ساتھ روک دیا گیا ہے۔ یہ حدیث بھی اسی بات کی تعلیم دیتی تھی ، جسے میرٹھی صاحب نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے رد کیا ہے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نماز کے انتظار کو نماز ہی شمار کرتے تھے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک رات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عشاء کی نماز کے لیے تقریباً آدھی رات تک رسول اللہ ﷺ کا انتظار کیا ، پھر آپ ﷺ تشریف لائے ، خطبہ ارشاد کیا اور فرمایا: ((أَلَا إِنَّ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا ، ثُمَّ رَقَدُوا ، وَإِنَّكُمْ لَمْ تَزَالُوا فِي صَلَاةٍ مَا

انتظرتُم الصَّلَاةَ)) ”خبردار! یقیناً (مدینہ سے باہر رہنے والے مسلمان) لوگ نماز پڑھ چکے ، پھر سو بھی چکے ہیں ، بلاشبہ تم جب تک نماز کا انتظار کرتے رہے ہو ، نماز میں ہی رہے ہو۔“

(صحیح بخاری: ۶۰۰، صحیح مسلم: ۶۴۰)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(( لا يزال العبد في صلاة ما كان في المسجد ينتظر الصلاة ما لم يحدث ))

”بندہ جب تک با وضو ہو کر مسجد میں نماز کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے، نماز میں ہی ہوتا ہے۔“

(صحیح بخاری: ۱۷۶، صحیح مسلم: ۶۴۹)

سیدنا سہل بن سعد الساعدي رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(( من كان في المسجد ينتظر الصلاة ، فهو في الصلاة ))

”جو نماز کے انتظار میں مسجد کے اندر ہو، وہ نماز میں ہی ہوتا ہے۔“

(مسند الامام احمد: ۳۳۱/۵، سنن النسائي: ۷۳۴، وسنده حسن)

اس حدیث کو امام ابن حبان رحمہ اللہ (۱۷۵۲) نے ”صحیح“ قرار دیا ہے۔ کتب حدیث میں اس کے کئی اور شواہد بھی موجود ہیں۔

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم تھی، اس کا اثر یہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی نماز کے انتظار کو نماز ہی شمار کرتے تھے، جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے نماز جمعہ کے دن قبولیت والے وقت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ وقت عصر سے مغرب کے درمیان ہوتا ہے، آگے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی زبانی سنئے:

فقلت : إن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : في صلاة ، وليست بساعة صلاة ، قال : أو لم تعلم أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : (( منتظر الصلاة في صلاة )) ، قلت : بلى هي ، والله ! هي .

”میں نے (عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے) کہا، بلاشبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے کہ (یہ وقت) نماز میں ہوتا ہے اور یہ (عصر سے مغرب تک کا وقت) تو نماز کا وقت نہیں ہے، انہوں نے فرمایا، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ نماز کا انتظار کرنے والا نماز میں ہی ہوتا ہے؟ میں نے کہا، ہاں! یہ وہی وقت ہے، اللہ کی قسم! یہ وہی وقت ہے۔“

(مسند الامام احمد: ۴۵۰/۵، سنن ابی داؤد: ۱۰۴۶، سنن الترمذی: ۴۹۱، سنن النسائي:

۱۴۳۰، سنن ابن ماجہ: ۱۱۳۹، وسنده صحيح)

اس حدیث کو امام ابن حبان رحمہ اللہ (۷/۷، ح: ۲۷۷۲) نے ”صحیح“ کہا ہے، امام حاکم

(۲۷۹/۱) نے اسے ”بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح“ قرار دیا ہے۔ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی موافقت بھی کی ہے۔ حافظ نووی رحمہ اللہ نے بھی اس کی سند کو ”بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح“ کہا ہے۔

جب خطبہ نماز جمعہ کا حصہ ہے، نیز رسول اللہ ﷺ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز کے لیے بیٹھنے کو بھی نماز ہی شمار کرتے تھے تو پھر زائدہ کا نماز اور باقی راویوں کا خطبہ کہنا مخالفت کیسے بن گئی؟ کیا خطبہ سننے والا نماز کے لیے بیٹھا نہیں ہوتا؟ معلوم ہوا کہ نماز سے مراد بھی خطبہ ہی ہے، لہذا یہ مخالفت نہیں۔

امام بیہقی رحمہ اللہ (م ۴۵۸ھ) فرماتے ہیں: وقول من قال: نصلیٰ معہ الجمعة أراد به الخطبة، وكأنه عبر بالصلاة عن الخطبة...

”جن راویوں نے یہ کہا ہے کہ ہم آپ ﷺ کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھ رہے تھے، انہوں نے خطبہ ہی مراد لیا ہے، گویا کہ انہوں نے خطبہ کو نماز سے تعبیر کر لیا ہے۔“ (السنن الكبرى للبيهقي: ۱۸۲/۳)

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ (م ۷۹۵ھ) لکھتے ہیں: وقوله في الرواية التي خرجها البخاري: بينما نحن نصلیٰ مع النبي، لم يرد به أنهم انفضوا عنه في نفس الصلاة، إنما أراد به - والله أعلم - أنهم كانوا مجتمعين للصلاة، فانفضوا وتركوه.

”راوی کا امام بخاری کی بیان کردہ ایک روایت میں یہ کہنا کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، اس سے راوی کی مراد یہ نہیں کہ وہ آپ ﷺ کو نماز کے اندر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، بلکہ اس کی مراد یہ ہے کہ وہ نماز کے لیے جمع ہو چکے تھے، پھر وہ بھاگ گئے اور آپ ﷺ کو چھوڑ گئے۔“

(فتح الباری لابن رجب: ۴۲۴/۵)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (م ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں: فقوله: نصلیٰ، أي ننتظر الصلاة، وقوله: في الصلاة، أي في الخطبة...

”راوی کا کہنا کہ ہم نماز پڑھ رہے تھے، اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نماز کا انتظار کر رہے تھے اور راوی کا کہنا کہ ہم نماز میں تھے، اس سے مراد ہے کہ ہم خطبہ میں تھے۔۔۔“ (فتح الباری لابن حجر: ۴۲۳/۲)

اتنی سی بات میرٹھی صاحب کی عقل میں سمجھنے کی اور انہوں نے امت مسلمہ کے اتفاقی فیصلے صحیح بخاری پر اعتراضات شروع کر دیئے ہیں۔ اب تو یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر منکر حدیث، حدیث اور اصول حدیث سے جاہل ہوتا ہے۔ کاش کہ میرٹھی صاحب صحیح بخاری پر اعتراضات کرنے کی بجائے



اپنے مطالعہ حدیث کو وسیع کر لیتے!

② میرٹھی صاحب کا یہ کہنا بھی بہت بڑا جھوٹ ہے کہ حصین بن عبدالرحمن سے اس حدیث کو پانچ شاگرد بیان کرتے ہیں، کیونکہ صحیح بخاری (۲۰۶۴) میں ہی حصین سے ایک اور شاگرد محمد بن فضیل (ثقة) بھی ان سے یہی حدیث روایت کر رہے ہیں۔ اسی طرح مسند عبد بن حمید (۳۳۵/۱)، ح: ۱۱۱۰ میں ساتویں شاگرد سلیمان بن کثیر (صالح الحدیث فی غیر الزہری) بھی حصین سے یہی روایت بیان کر رہے ہیں۔

البتہ وہ دونوں بھی زائدہ کی طرح خطبہ کی بجائے نماز کا ذکر کرتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے میرٹھی صاحب اسے ڈکار گئے ہیں کہ اس طرح یہ کہنا صحیح نہیں رہے گا کہ صرف زائدہ نے یہ الفاظ بیان کیے ہیں، بلکہ اب تو تین راوی اسی طرح بیان کر رہے ہیں!

جب زائدہ کے ساتھ ساتھ محمد بن فضیل اور سلیمان بن کثیر بھی نماز ہی کا ذکر کر رہے ہیں تو میرٹھی صاحب اب کس کس راوی کو وہی قرار دے کر اپنا مدعا حاصل کریں گے؟  
اب قارئین خود اندازہ کر لیں کہ ان کے سب سے بڑے اعتراض کا یہ حال ہے، بعد والوں میں کتنی علمی جان ہوگی؟

**اعتراض نمبر ② :** ”اور اسناد کا اختلاف یہ ہے کہ زائدہ کی روایت

کے مطابق سالم بن ابی الجعد نے حدَّثنا جابر کہا تھا۔ پس سالم نے یہ حدیث حضرت جابر سے سنی تھی، لیکن خالد و جریر و ہشیم و ابن ادریس چاروں کی روایت میں عن جابر ہے، جو اتصال و انقطاع دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ پس یہ سمجھنا بے جا نہیں کہ جیسے زائدہ کو اس کے متن میں وہم ہو گیا تھا، اسی طرح وہ اس کی اسناد میں بھی وہم کا شکار ہو گئے تھے کہ عن جابر کی بجائے حدَّثنا جابر کہہ دیا۔ اور معلوم ہے کہ سالم بن ابی الجعد کثیر الارسال تابعی تھے۔ سالم نے حضرت عمرو عثمان و علی و ثوبان و عبد اللہ و ام مسعود و ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور عمرو بن عبسہ و ابو الدرداء و جابان و زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ سے حدیثیں روایت کی ہیں اور وہ سب مرسل ہیں۔ سالم نے ان حضرات میں سے کسی سے کوئی حدیث نہیں سنی۔ پس یہ حدیث بھی سالم نے حضرت جابر سے براہ راست نہیں سنی، کسی نے ان سے بیان کر دی تھی۔ موصوف نے اس کا نام ذکر نہیں کیا۔۔۔“ (”صحیح بخاری کا مطالعہ“: ۸۰/۱)

جواب :

① قارئین کرام! میرٹھی صاحب کا کہنا ہے کہ جس طرح زائدہ کو متن

میں وہم ہو گیا تھا، اسی طرح اسناد میں بھی وہ وہم کا شکار ہو گئے ہیں، لیکن آپ بخوبی جان چکے ہیں کہ زائدہ کو متن میں کوئی وہم نہیں ہوا، بلکہ وہ میرٹھی صاحب کی اپنی علمی بے مائیگی تھی، لہذا جیسے زائدہ کو متن میں وہم نہیں ہوا تھا، اسی طرح اسناد میں بھی وہ وہم کا شکار نہیں ہوئے۔ یہاں بھی میرٹھی صاحب کی اپنی عقل ہی چکرائی ہے۔

② اب میرٹھی صاحب کی اصول حدیث سے جہالت ملاحظہ فرمائیں کہ:

(۱) وہ صیغہ ”عن“ کو اتصال و انقطاع دونوں کا محتمل قرار دے کر اس حدیث کے ضعف کا سبب بنا رہے ہیں، حالانکہ ہم گزشتہ صفحات میں اصول محدثین کی روشنی میں بارہا یہ واضح کر چکے ہیں کہ صرف ”مدلس“ راویوں کی طرف سے بولا گیا یہ لفظ اتصال و انقطاع دونوں کا احتمال رکھتا ہے، لیکن اگر یہ لفظ ”غیر مدلس“ راویوں کی طرف سے بولا گیا ہو تو اتصال ہی کے لیے ہوتا ہے، دوسرا کوئی احتمال اس میں نہیں ہوتا۔ سالم بن ابی الجعد کثیر الارسال تو ہیں، مگر ”مدلس“ نہیں ہیں، لہذا ان کے عن کہنے کو انقطاع پر محمول کرنا صریح جہالت ہے، کوئی علمی کاوش نہیں!

اب بالفرض زائدہ کو وہم بھی ہوا ہو تو اصول محدثین کے مطابق یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔

میرٹھی صاحب کے معتقدین سے عرض ہے کہ اگر وہ میرٹھی صاحب کے اس قانون کو صحیح سمجھتے ہیں تو اسے اصول حدیث کی روشنی میں ثابت کر دیں، ورنہ انکا حدیث سے توبہ کر لیں۔

(ب) کسی کثیر الارسال راوی کا کچھ لوگوں سے ارسال کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ اس کی ہر روایت ”مرسل“ ہی شمار ہوگی، بلکہ جن اساتذہ سے اس کے سماع کے نہ ہونے پر کوئی دلیل قائم ہو جائے، ان سے اس کی روایت ”مرسل“ ہوتی ہے اور باقی سب اساتذہ سے ان کی حدیث بالکل صحیح ہوگی۔ اسے ”مرسل“ کہنا انتہائی بے اصولی ہے۔

محدثین کرام رحمہم اللہ نے اس موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں انہوں نے کثیر الارسال راویوں کے ان اساتذہ کے نام ذکر کر دیئے ہیں، جن سے انہوں نے ”مرسل“ احادیث بیان کی ہیں، مثلاً المراسیل لابن أبی حاتم، جامع التحصیل لأحكام المراسیل، تحفة التحصیل لأحكام المراسیل، وغیرہا اب اگر ان کتب میں محدثین جابر رحمہم اللہ کے بارے میں بھی



صراحت کر دیں کہ سالم بن ابی الجعد کی ان سے روایت ”مرسل“ ہے تو سر آنکھوں پر، لیکن اگر وہ ایسا نہ کریں، تو پھر بھی ان احادیث کو ”مرسل“ کہنا بہت بڑی جہالت یا بڑی ہٹ دھرمی و بے شرمی ہے۔  
اس پر مستزاد یہ کہ محدثین نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے سالم بن ابی الجعد کے خود سننے کی صراحت بھی کر دی ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا:

ولم یسمع من ثوبان ، وسمع من جابر بن عبد الله وأنس بن مالك .

”اس (سالم بن ابی الجعد) نے ثوبان رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا، البتہ سیدنا جابر بن عبد اللہ اور سیدنا انس

ابن مالک رضی اللہ عنہ سے احادیث سنی ہیں۔“ (العلل الكبير للترمذی بحوالہ تحفة التحصيل : ۱/ ۱۲۰)

قارئین کرام خود فیصلہ کریں کہ اتنی صراحت کے بعد بھی جو شخص سالم بن ابی الجعد کی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کو ”مرسل“ قرار دیتا ہے، اس کی علمی اہلیت کتنی ہوگی؟  
ہر سلیم القلب شخص خود سوچ لے کہ وہ محدثین کرام کی بات مان کر اس حدیث کو ”متصل“ مانے لگا یا  
فہم حدیث سے بالکل جاہل شخص کی بات مان کر اسے ”مرسل“ قرار دے گا!

اس پر طرہ یہ ہے کہ اس حدیث میں سالم بن ابی الجعد نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے اپنے سننے کی صراحت بھی کی ہوئی ہے، جسے وہم قرار دینے کی میرٹھی کاوش بار آور نہیں ہوئی۔

پھر اس پر طرہ در طرہ یہ ہے کہ اس حدیث کو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے صرف سالم بن ابی الجعد اکیلے بیان نہیں کر رہے، بلکہ ایک اور راوی ابوسفیان طلحہ بن نافع (حسن الحدیث) بھی سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے یہی حدیث بیان کر رہے ہیں۔ (صحیح مسلم : ۸۶۳) میرٹھی صاحب نے اس پر بھی اپنی اُلٹی منطق چلانے کی کوشش کی ہے، جس کا بھرپور رد ہم اگلے اعتراض کے جواب میں کریں گے۔ ان شاء اللہ!

اللہ کے لیے میرٹھی صاحب کے معتقدین ہی بتائیں کہ کیا تحقیق و تنقید اسی کا نام ہے؟؟؟

**اعتراض نمبر ۳ :** ”اور حصین کے تلامذہ میں سے ہشیم و خالد بن عبد اللہ نے

اس کی اسناد میں سالم بن ابی الجعد کے ساتھ ابوسفیان طلحہ بن نافع کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن ابوسفیان کی حضرت جابر سے روایت کردہ اکثر احادیث ”مرسل“ ہیں۔ شعبہ علی بن المدینی نے کہا ہے کہ ابوسفیان نے حضرت جابر سے بس چار حدیثیں سنی تھیں۔۔۔“ (صحیح بخاری کا مطالعہ : ۸۰/۱ - ۸۱)

**جواب :** ① اکثر احادیث ”مرسل“ ہونے سے تمام احادیث کا ”مرسل“ ہونا تو

لازم نہیں آتا۔ چار احادیث کے سننے کا تو میرٹھی صاحب کو بھی اعتراف ہے، وہ چار کون سی تھیں؟

آئیے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے پوچھتے ہیں کہ وہ چار احادیث کون سی تھیں، وہ لکھتے ہیں:

”امام بخاری رحمہ اللہ نے اس (ابوسفیان طلحہ بن نافع) کی صرف چار احادیث ہی بیان کی ہیں، میرے خیال میں یہ وہی چار حدیثیں ہیں، جو امام موصوف کے استاذ علی بن المدینی نے مراد لی ہیں۔ ان میں سے دو حدیثیں کتاب الاثر بہ میں ہیں، جنہیں امام صاحب نے ابوصالح کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے اور اسی طرح ایک فضائل میں ہے اور چوتھی سورہ جمعہ کی تفسیر میں (زیر بحث) ہے، اس کو امام صاحب نے سالم بن ابی الجعد کی حدیث کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے۔“ (تہذیب التہذیب: ۵/۲۶)

معلوم ہوا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ علی بن المدینی نے طلحہ بن نافع کے سماع والی جو چار احادیث بتائیں تھیں، امام بخاری نے صرف انہی کو اپنی صحیح میں پیش کیا ہے، کیونکہ امام صاحب صحت حدیث میں بہت ہی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ امام موصوف کی اس باریک بینی کو خود میرٹھی صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں: ”صحت حدیث کا التزام کر کے عالی مرتبہ شیخین (بخاری و مسلم) نے علمائے معاصرین اور بعد میں آنے والے مصنفین و محدثین کے لیے نہایت اچھی مثال پیش کر دی تھی اور تحقیق کی وہ صحیح راہ دکھا دی تھی، جس پر چلنے سے سنت نبویہ کی غل و غش سے حفاظت ہو سکتی تھی۔“

(”صحیح بخاری کا مطالعہ“: ۱/۱۵)

ساری دنیا کو تحقیق کی راہ دکھانے والے امام بخاری رحمہ اللہ کو بھلا اپنے استاذ کی وہ بات معلوم نہ ہوئی ہوگی، جو میرٹھی صاحب کو بھی معلوم ہوگئی ہے اور انہوں نے خود تحقیق کی راہ پر چل کر بھلا اپنے استاذ کی بتائی ہوئی چار احادیث کا خیال نہیں کیا ہوگا؟

پوری امت مسلمہ نے صحیح بخاری و صحیح مسلم کی صحت پر جو اتفاق کیا ہے، وہ خود اس بات کی بڑی ٹھوس دلیل ہے کہ یہ حدیث انہی چاروں حدیثوں میں سے ہے، جو ابوسفیان طلحہ بن نافع نے اپنے استاذ سیدنا جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے سنی ہیں۔ اس کے برعکس میرٹھی صاحب اپنے موقف کی تائید میں کوئی دلیل پیش نہیں کر پائے۔ اس بارے میں بھلا امام بخاری اور پوری امت کے بڑے بڑے علمائے کرام کی بات مانی جائے گی، جو اس فن میں مہارت تامہ رکھتے تھے یا میرٹھی صاحب کی بات مانی جائے گی، جو کہ حدیث اور اصول حدیث کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں؟ جاری ہے۔۔۔

## اہل سنت کون؟

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ اللَّهَ يَقْبَلُ الصَّدَقَةَ وَيَأْخُذُهَا بِمِيمِنِهِ، فَيَرْبِّيْهَا لِأَحَدِكُمْ، كَمَا يَرْبِّيْ أَحَدَكُمْ مَهْرَهُ، حَتَّى إِنَّ اللَّقْمَةَ لِتَصِيرَ مِثْلَ أَحَدٍ)) ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ صدقہ کو قبول کرتا ہے اور اسے اپنے دائیں ہاتھ سے پکڑتا ہے، پھر اس کی پرورش کرتا ہے، جیسا کہ تم میں سے کوئی ایک اپنے گھوڑے کے بچے کی پرورش کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک لقمہ احد پہاڑ کی طرح ہو جاتا ہے۔“ (سنن الترمذی: ۶۶۲، وسندہ ضعیف، والحديث صحيح، انظر: صحيح البخاری: ۱۴۱۰، صحيح مسلم: ۱۰۱۴)

اس حدیث کے تحت امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ (۲۷۹ھ) فرماتے ہیں:

”بہت سے اہل علم نے اس اور اس مفہوم کی دوسری احادیث صفاتِ الہی و نزولِ باری تعالیٰ کے بارے میں کہا ہے کہ اس بارے میں روایات ثابت ہو گئی ہیں، ان پر ایمان لایا جائے گا، ان میں تاویل نہیں کی جائے گی، نہ ہی یہ کہا جائے گا کہ یہ صفاتِ الہی کیسی ہیں؟ امام مالک، امام سفیان بن عیینہ اور امام عبداللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح منقول ہے، انہوں نے ان احادیث کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان کو ظاہری معنی پر محمول کیا جائے (تاویل نہ کی جائے)، اہل سنت والجماعت کے اہل علم کا یہی قول ہے۔ رہے جمعی لوگ تو انہوں نے ان روایات کا انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ تشبیہ ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر صفتِ ید، سمع اور بصر کا ذکر کیا ہے، لیکن جمعیہ نے ان آیات کی تاویل کی ہے اور اہل علم کے خلاف ان کی تفسیر کی ہے، جمیوں کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا، بلکہ یہاں ید (ہاتھ) سے مراد قوت ہے۔ امام اسحاق بن ابراہیم (ابن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا ہے کہ تشبیہ تو اس وقت ہوگی، جب کہا جائے گا کہ (اللہ تعالیٰ کا) ہاتھ (مخلوق کے) ہاتھ کی طرح ہے یا اس کی مثل ہے، (اللہ تعالیٰ کی) صفتِ سمع (مخلوق کی) سمع کی طرح ہے اور (اللہ تعالیٰ کی) صفتِ بصر (مخلوق کی) بصر کی طرح ہے۔ لیکن جب کوئی آدمی اسی طرح کہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ ید، سمع اور بصر اس کی صفات ہیں، کوئی کیفیت بیان نہ کرے، نہ ہی یہ کہے کہ (اللہ تعالیٰ کی) صفتِ ید، سمع، بصر (کسی مخلوق کی) صفتِ ید، سمع اور بصر کی مثل ہے تو یہ تشبیہ نہیں ہوگی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوری: ۱۱) (اللہ جیسی کوئی شے نہیں، وہ سننے اور دیکھنے والا ہے)۔“ (سنن ترمذی: ۶۶۲)